بوگی نمبر بارہ
تحریر : مہرالنساء شاہ میر

ہاں ہم نے ملک کو بنتے دیکھا ہے۔

ہم نے جسم کا جلنا،اپنوں کا مرنا دیکھا ہے۔

میراث کا چھیننا،لہو کا بہنا دیکھا ہے۔

تخت الٹتے دیکھا ہے، پھر وقت پلٹتے دیکھا ہے۔

ہاں ہم نے ملک کو بنتے دیکھا ہے۔

لمحہ وہ کہ جب لہو کی بوند بوند گری تھی۔

ساعت وہ جب چادر کی عزت مری تھی۔

وقت کے نہاں خانوں میں جب بے حسی پلی تھی۔

ہاں ہم نے وہ وقت گزرتے دیکھا ہے۔

زندہ جسموں کو بن روح ہوتے دیکھا ہے۔

سیاہ کاروں کو بن عیوب پلتے دیکھا ہے۔

خطا کاروں کو پھر ہاتھ ملتے دیکھا ہے۔

ہاں ہم نے ملک کو بنتے دیکھا ہے۔

کیوں ہو تم ورطہ حیرت، کیوں ہو سوچ میں ڈوبے۔

ہاں نہیں تھا روبرو میں جب قافلے گئے لوٹے۔

وہ وقت تھا کاذِب، ماکر سا، جب ہاتھ بھائی سے بہن کے چھوٹے۔

ہاں ہم نے ملک کو بنتے دیکھا ہے۔

غور سے ہم کو دیکھو تم، پھر سوچ بدلتے دیکھو تم۔

میں ہوں قاری، وہ ہے لکھاری، یہ ہے احساس کی ماری۔

ہم نے لفظوں کے آئینے سے ماضی میں جا کر دیکھا ہے۔

قلم کی نوک سے شمشیر کا چلنا دیکھا ہے۔

سیاہی کے قطروں سے لہو کا بہنا دیکھا ہے۔

ہم احساس کے ماروں نے، جسموں کا کٹنا دیکھا ہے۔

اے لٹ چکے قافلوں،اے چھوٹے ہوئے ساتھیوں۔

اے ماؤں کے راج دلاروں،اے بہنوں کے جوان بھائیوں۔

اے میراث لٹائے،عزت فنا کر آئے ہوؤں۔

اے وطن چھوڑ نئی زمین بسانے آنے والیوں۔

ہم نے لفظوں سے،داستانوں سے،تمہارا کرب پڑھا ہے

پھر درد کو تمہارے سہا ہے۔دیوانے کے خواب کو یقین میں بدلتے دیکھا ہے۔

ہاں ہم نے ملک کو بنتے دیکھا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

سن: 1947

شہر :لاہور۔

وقت :رات کا آخری پہر۔

لاہور۔۔زندہ دلان لوگوں کا شہر۔کھانے،روشنی،ثقافت،اور محلوں کا شہر،اونچے محل،عالیشان درباروں کا شہر۔شہر کی رونق تو ان دنوں میں ہوتی ہوگی جب بادشاہوں کے دربار لگا کرتے تھے،جب شاہی سواریاں لاہور کے سینے پہ بھاری قدم دھرتے ہوئے گزرا کرتی ہوں گی،اور جب محل سے آتی بگھی کی شان میں مرد سر جھکا دیتے ہوں گے۔جب آدھا لاہور محل کے پکوانوں کی خوشبو کو اپنے اندر سمو لیتا ہوگا۔کچھ لوگ کہتے تھے یہ کیسا وقت تھا؟ ؟ بلکہ یہ وقت نہیں تھا یہ خدا کا عذاب تھا۔ہاں یہ عذاب ہی تو تھا کہ لاہوری کھانا چھوڑ بٹوارے کی بات کرتے تھے۔جب گلیوں میں نگاڑے نہیں ریڈیو کی آواز گونجتی تھی۔جب بڑے بوڑھے مدھم موسیقی چھوڑ،بابائے قوم کے پیغام سنا کرتے تھے۔ لاہوریوں کی چمکتی آنکھیں اب آس زدہ تھیں۔آزادی کی آس، شہر لاہور کی کنیت سے ہندوستان ہٹا کر پاکستان لگنے کی آس۔

وہ وقت بیت چکا تھا جب لاہور کے بازاروں میں چوڑیاں بکتی تھیں۔یہ وہ وقت تھا جب اسلحے تیار کئے جا رہے تھے۔کچھ کو لگتا تھا لاہور آسیب زدہ ہو گیا ہے۔لیکن مرد مجاہد جانتے تھے کہ، لاہور کو چن لیا گیا ہے۔قربانیوں کے لئے، ملک کی بقاہ میں اپنا کردار ادا کرنے کے لئے۔ہاں رونقیں ماند ہوئی تھیں، لیکن وقتی طور پہ،ہاں کھانے کی خوشبو نے لاہور سے منہ موڑا تھا،لیکن واپسی دعوتوں کے ساتھ ہونی تھی۔کیا وقت ہوگا وہ جب دھول سے اٹے چہرے،جب جائیدادیں لٹائے ہوئے لوگ سر زمین لاہور پاکستان میں اپنے قدم دھریں گے۔اور انکی آنکھیں کہتی ہوں گی

"تمھیں پاکستان مبارک۔" تب لاہور کی رونق لوٹ آئے گی، تب امرتسر سے آئے مسلمان بھائیوں کے لئے دستر خوان سجیں گے،تب ہندوستان سے آئی اپنی دین شریک بہنوں کے دوپٹوں کی حفاظت کے لئے اسلحہ کام آئے گا۔ہاں لاہور کی رونق ایک بار پھر لوٹ آئے گی۔

کہانی ایک چھوٹے کچے گھر سے شروع ہوتی ہے۔کچی آبادی کے ایک کچے گھر میں صحن چارپائیوں سے بھرا پڑا تھا۔ایک طرف کو ہوائی جھلی (جھلی ایک قسم کا پنکھا ہوتی ہے،یوں کہ ایک بڑے سے لکڑی کے بانس کو صحن کے بیچ و بیچ لگایا جاتا ہے،اور اسکے سر پہ کوئی بڑی سی چادر اٹکائی جاتی ہے۔جھلی کے بانس کے ساتھ رسی سے گدھے کو باندھا جاتا ہے اور اسکی آنکھوں پہ پٹی ہوتی ہے۔گدھا صحن کے چکر کاٹے جاتا ہے اور جھلی ہوا کے دوش پہ صحن میں سوئے لوگوں کو فرحت بخش ہوا دیتی ہے۔رات کے کسی بھی پہر اگر گدھا تھک کر رک جاتا،اور گھر کے کسی فرد کی نیند کھل جاتی تو ایک پتلی لکڑی گدھے کے جسم پہ پڑتی اور یوں وہ ایک بار پھر جھلی چلانے لگ جاتا) باندھی گئی تھی۔جس کو چلاتا گدھا یوں سمجھتا تھا کہ وہ ہندوستان کی سیر کو نکلا ہے۔صبح کی پو پھوٹنے میں ابھی تھوڑا ہی سمے تھا۔ صحن کے ایک طرف بنے باورچی خانے میں اس وقت دو عورتیں بیٹھی تھیں۔ ایک کے ہاتھ میں لال ٹین تھا۔اور دوسری چہرہ چولہے کے قریب جھکائے،پھونک مار مار کر کوئلے دہکا رہی تھی۔اسی کوشش میں اسکا تنفس پھول جاتا تھا،لیکن مجال ہے جو ان کمبخت کوئلوں نے آگ پکڑی ہو۔دفعتاً لالٹین والی لڑکی نے زور سے لالٹین کو زمین پہ رکھا،دھپ کی آواز پہ اسکے سامنے بیٹھی عورت کو بے اختیار ہول اٹھے تھے۔

"مرن جوگیئے، تیرے باوا اٹھ جائیں گے۔"ضعیف لڑکھڑاتی آواز میں تنبیہ کی گئی۔

"اچھا ہی ہے اٹھ جائیں۔باوا کو بھی پتہ لگ جائے، صبح امرتسر جانا ہے،اور یہاں میں خود کو دھوئیں میں جھونک رہی ہوں۔" یہ آواز پہلی والی سے مختلف تھی۔بے زار،اکھڑ،معصوم اور الھڑ۔

"دیکھ رعنا۔۔۔مردوں سے مقابلہ کرنے والی عورت کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔تو مرد کی ایک سن لے، وہ تیری دس سنے گا۔"زمانہ شناس لہجے میں سمجھداری تھی۔

اسی لمحے کوئلوں نے وہ آگ پکڑی کہ چولہا دہک اٹھا۔

"آج تک آپ نے باوا کی دس لاکھ سنی ہیں، پھر کیوں وہ آپ کی ایک نہیں سنتے؟" لالٹین اور جلتی آگ میں اسکا چہرہ ہلکا سا واضح تھا۔

بڑی بڑی سیاہ آنکھیں،جن پہ گھنی لمبی پلکوں کا سایہ تھا۔رنگت سانولی تھی،ناک اٹھی ہوئی،نچلا ہونٹ موٹا اور اوپری اسکی نسبت پتلا،بھرے بھرے گال اور پرکشش نقوش۔یوں لگتا تھا اس نے لاہور کا سارا حسن چرا لیا ہو۔

"تیری زبان آج کل بہت تیز چل رہی ہے۔ابھی تو امرتسر گئی نہیں اور ابھی سے یہ تیور؟"انہوں نے گھرکا تھا۔

وہ چولہے پہ اب دودھ کی دیگچی رکھ رہی تھیں۔لڑکی کی آنکھیں یکدم چمک اٹھیں۔"اماں امرتسر کیسا ہے؟وہاں کے لوگ، کھانا، وہاں کی کوٹھیاں کیسی ہیں؟"۔

"لے جھلی بھلا امرتسر میں نیا کیا ہونا ہے؟وہی لوگ، وہی کھانے،وہی روایت،رکھ رکھاؤ،اللہ کی زمین ہے جیسی یہاں ویسی وہاں۔تو بتا تجھے امرتسر کیوں جانا ہے۔"بوڑھے جھری زدہ چہرے پہ

مسکراہٹ تھی، مٹھی میں چینی بھری تھی، جسے وہ دیگچی میں پلٹ رہی تھیں۔لڑکی نے اسکی بات پہ چہرے کے نقش بگاڑ لئے۔

”ایسے کیسے جیسی زمین یہاں ویسی وہاں،لاہور ایک ہی ہے اماں،یہاں کا رکھ رکھاؤ بھی ایک،دنیا کا کوئی دوسرا خطہ لاہور نہیں بن سکتا۔میں تو امرتسر اس لئے جا رہی ہوں،تاکہ جب نوری بڑی ہو گی تو میں اسکو بتاؤں گی،لاہور لاہور ہے۔امرتسر میں لاہور والی بات نہیں۔“ وہ ایک پل کو رکی، سرمئی بالوں والی بوڑھی عورت پہ ایک خفا خفا سی نظر ڈالی۔”اور اماں میری بات سن لیں،لاہور کی زمین الگ،تو امرتسر کی الگ۔اگر ہم ایک ہوتے تو ملک کا بٹوارہ نہ ہو رہا ہوتا۔جناح کہتے ہیں ہم دو الگ الگ قومیں ہیں،ایک ساتھ ہمارا کوئی مستقبل نہیں۔“وہ بولنے پہ آئی تو بولتی چلی گئی۔بوڑھی عورت نے ٹھنڈی آہ بھری۔اور ابلتا دودھ آدھا پیتل کے گلاس میں انڈیلنے لگی۔اور باقی دودھ میں پتی ڈالنے لگیں۔

”یہ جناح، گاندھی اپنی راہ ہو لیں گے۔اور نقصان ہمارا ہووے گا۔ہک ہاہ کونسی دو قوم،کونسے مختلف نظریے،ساری زندگی انہی لوگوں کے ساتھ رہے،چھٹی کے کپڑے ان لوگوں کے تحفے تھے،اور اب کفن خریدیں گے پاکستانی۔“وہ سخت نالاں نظر آتی تھیں۔سیاہ آنکھوں والی لڑکی نے تاسف سے اپنی ماں کو دیکھا۔

”کیا آپ لکشمی تائی کا جھوٹا پی لیں گی اماں؟کیا اسکے کھائے برتن میں کھا لیں گی؟اسکی اترن پہن لیں گی؟یا پھر مندر سے آیا پرساد منہ میں رکھ لیں گی۔“

اماں کو گویا ہول اٹھے تھے۔بے اختیار کانوں کو ہاتھ لگایا۔

"توبہ توبہ رعنا اللہ تجھے سمجھے، بھلا لکشمی کا جھوٹا کیونکر پی سکوں؟ اسکی اترن اللہ معافی دے، جانے کتنی بار اسکی ساڑھی نے مندر کے فرش کو بوسہ دیا ہوگا۔ میں زہر کھالوں، لیکن مندر کا پارساد نہیں۔ اللہ میرے اللہ معافی۔" وہ ہنوز کانوں کو ہاتھ لگا رہی تھیں۔ گل رعنا مسکرائی۔

"جس قوم کے ساتھ برتن، کپڑے، کھانا نہیں بانٹ سکے، انکے ساتھ نسلیں، اور زمین کیسے بانٹ لیں اماں۔ نہ وہ پلید نہ ہم پاک۔ بس ہمارے منہ پہ کلمہ اور انکے منہ پہ رام۔"

"فرق کیا ہوا بھلا؟" اماں نے ٹھوڑی پہ انگلی جما کر سوال کیا۔

"فرق یہ ہوا کہ جن قوموں کا مستقبل ساتھ نہیں، انکا حال بھی ساتھ نہیں۔ بٹوارہ اماں، بٹوارہ، لاہور کی کنیت میں پاکستان کا نام۔" وہ جوش اور جذبے سے بولی، تو اماں سوچ میں پڑ گئیں۔

چولہے پہ رکھی چائے ابلتی رہی۔

☆☆☆☆☆

دہلی

بر صغیر کا دل، اور کئی ہزار گزر چکے بادشاہوں کی محل گاہ۔ وہ دہلی جس نے نہ جانے کس کس کے سیاہ اعمال اپنے دل میں چھپا رکھے تھے۔ جس کے سینے پہ ظلم و بربریت کی داستانیں رقم کی گئیں، اور وہی دہلی جہاں سخاوت کے در کھلے، دہلی کو ایک شہر کہنا غلط ہوگا، یہ تو ایک دنیا ہے، ڈھیروں ثقافتوں کا مرکز، کئی روایات کا امین، تاریخ کو اپنی آنکھوں کے سامنے بنتا، اور زوال کو اپنی آنکھوں کے سامنے پنپتا دیکھنے والا دہلی۔ ان دنوں دہلی اداس رہا کرتا تھا، اسے غم تھا۔ ہاں اسے غم تھا اس بٹوارے کا، وہ

اپنے لوگوں کو یہاں سے کسی پاکستان نامی سر زمین نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔دہلی اپنے پر رونق بازاروں کی رونق کو ختم ہوتے دیکھ رہا تھا،دہلی اپنے اندر بسی ثقافتوں کے زوال پہ افسردہ تھا۔کیا دہلی واقعی افسردہ تھا؟یا اپنے سینے پہ پنپتی سازشوں سے دہلی بھی مکر کرنا سیکھ چکا تھا؟

قدیم عمارات،بازاروں کی رونق،کھانوں کی خوشبو اور دہلی کی عظمت کا ذکر چھوڑ کر کہانی کی طرف بڑھو تو،ایک بوڑھی عمارت کہانی کا مرکز بننے کو بے تاب ہے۔گول چکر دار زینے پار کرتے،اوپری منزل پہ قدم دھرو تو،لکڑی کے دروازے والے ایک بڑے سے ہال میں اس وقت کئی لوگ جمع تھے۔لمبی میز کمرے کے وسط میں رکھی تھی۔جس کے اطراف میں مسلم لیگ کے نمائندان،مسلم لیگ کے جری لیڈر بیٹھے تھے۔سفید کرتے،سیاہ واسکٹ،اور مخملی ٹوپیاں سر پہ رکھے،سیاست دان کم،مرد مجاہد زیادہ۔ایسا ہی ایک جوان پورے قد کے ساتھ کھڑا تھا۔وہیں جہاں میز ختم ہوتی تھی۔اسکے چہرے پہ جوش بھرا تھا۔

”اور میں کامل ہشام آپ سب کو یقین دلاتا ہوں کہ بس انہی چند ماہ کے دوران، ہم سب ایک نئ سر زمین پہ قدم رکھیں گے، وہ جو نئ ہو کر بھی اپنی ہو گی۔ مسلم لیگ کا لیڈر ہونے کے ناطے میرا فرض ہے کہ میں دہلی کے،بنارس کے، ممبئ کے،اور سارے ہندوستان کے مسلمانوں کا سوچوں۔“اسکی آواز بھاری تھی۔لہجے میں جوش اور عزم تھا۔لوگ اسے سن رہے تھے۔لیکن انکے چہروں پہ جوش نمودار نہیں ہوتا تھا،ان کے چہروں پہ غیر آرام دہ تاثر تھا۔

”چھے ماہ ہونے والے ہندو مسلم دنگوں میں مسلمانوں کی ایک خطیر تعداد نے جانوں سے ہاتھ دھویا، مال گنوایا اور بے گھر ہوئے۔“ اس نے سانس لینے کا وقفہ لیا۔ لکڑی کے نقش و نگار والی کھڑکی سے دہلی کی دھوپ اندر آتی تھی۔ لیکن اسکی پشت سے ٹکرا کر پلٹ جاتی تھی۔

”میں آپ سے صرف اور صرف اتنا چاہتا ہوں، بلکہ مجھے یہاں یہ کہنے بھیجا گیا ہے کہ ان بے گھر ہوئے مسلمانوں کی ہم دادرسی کریں۔ اس وقت یہاں ہم سب مسلم لیگ کے وہ لیڈر ہیں جن کے پاس کوٹھیاں ہیں۔ جائیدادیں ہیں، اور روپیہ پیسہ ہے۔ کیوں نہ ہم اس پیسے سے اپنے بھائیوں کی مدد کریں۔ کیا خیال ہے لیگ کے رہنماؤں۔“ دفتر میں گونجتی اسکی بھاری آواز خاموش ہوئی۔ اب کے اسکی نظریں بولتی تھیں۔ وہ جواب طلب نگاہوں سے سفید لباس والے لیگیوں کو دیکھ رہا تھا۔ جب ایک صاحب کھنکھارے۔

”کامل ہشام صاحب۔۔۔ دنگوں کے وقت آپ کہاں تھے ؟“ سلطان نواز ٹھوڑی تلے ہتھیلی جمائے سکون سے پوچھ رہے تھے۔ کامل کے چہرے پہ سایہ سا لہرایا۔ ”جس وقت دہلی کے، بمبئی، لکھنئو اور سارے ہندوستان کے مسلمان دنگوں کی زد میں تھے۔ اس وقت آپ بنارس کے اس محلے میں تھے۔ جہاں ڈیڑھ سو گھر ہندوؤں کا، اور ایک گھر جناب کامل ہشام صاحب کا ہے۔“ یہ وار زہر بھرا تھا۔ کامل کا چہرہ سبز پڑنے لگا۔ وہ یہاں اس لئے نہیں آیا تھا۔

”ہم ان دنگوں میں تھے کامل صاحب۔“ اب کے متین خان بولے۔ ”ہم نے لاٹھیاں کھائیں، ہم پہ بندوقیں چلیں، ہمارے منہ پہ جوتے مارے گئے، ہمارا جسم لہولہان ہوا۔ لیکن ہم تھے۔“ انہوں نے اپنے لفظوں پہ زور دیا۔ ”ہم بنارس کے کسی بوسیدہ محلے میں تلسی کی پوجا کرتی ہندو کی آواز نہیں سن رہے

تھے،ہم مندر سے آیا پرساد نہیں کھا رہے تھے۔وہ آپ تھے۔ہندوؤں کے محلے سے اٹھ کر آئے ہوئے۔اب آپ ہمیں بتائیں گے ہمارے مسلمانوں کے لئے ہمیں کیا کرنا ہے؟" انکا لہجہ تضحیک آمیز تھا۔کامل کو سانس لینے میں دشواری ہونے لگی۔

"میری کوٹھی میں اس وقت ڈیڑھ ہزار مسلمان پناہ گزین ہیں ۔"بولنے والے اب کے اسد امین تھے۔"ہم جانتے ہیں حق کا کلمہ پڑھتے لوگوں کا دکھ۔اب آپ بتائیں گے مہاجرین کو پناہ دینے کی افادیت کیا ہے۔وہ جن کی اپنی کوٹھی میں اس وقت کئی برہمن منہ لپیٹے پڑے ہیں ؟"کامل کی ٹانگیں کھڑے کھڑے سن ہونے لگیں۔زبان تالو سے چپک گئی تھی۔

"ہم آپ کی بات مان لینے کو تیار ہیں کامل صاحب بس ہمیں یہ بتا دیں دنگے کے روز آپ بنارس میں کیا کر رہے تھے؟"

"میں اپنی امی سے ملنے گیا تھا۔"آواز ہلکی تھی۔

" تقسیم کا اعلان آج ہوا کہ کل ہوا،اور آپ کی امی جان اب تک پنڈتوں کے محلے میں قیام فرما رہی ہیں؟پوچھ سکتے ہیں کیوں؟ "کامل سے کوئی جواب نہ بن پایا،دھوپ اب اسکے بدن کو جھلسا رہی تھی۔

" چلیں آپ کی ہر بات ہمیں منظور ہے،ہماری حویلی،جائیداد،وراثت سب مسلم لیگ پہ قربان،(**اور انکی آنکھیں کہتی تھیں کہ وہ سچ کہہ رہے تھے۔**)آپ بتائیں کامل،بنارس والی کوٹھی میں ڈیڑھ سو ہندو کیوں پناہ لئے ہوئے ہیں؟دنگے میں تو بنارس کے مسلمان شہید ہوئے تھے ناں۔ پھر آپ کے گھر میں برہمن کیوں ہیں؟ "سعد رفیق احمد اپنی جگہ سے اٹھ کر بولتے ہوئے کامل کے عین سامنے آ کر رکے۔آنکھیں

سخت تھیں، چہرہ نفرت زدہ۔کرب زدہ۔"ہمارے مسلمان ذلیل و خوار ہو رہے ہیں اور آپ اور آپ کی امی جان بجائے ان ہندوؤں کے منہ پہ تھوکنے کے،انکے استعمال کئے غسل خانے دھو رہے ہیں؟"

"تو کیا کریں؟ بندوق اٹھا کر لاشیں گرا دیں؟" کامل غرایا۔"آپ بتائیں کیا کریں ہم۔وہ ہندو بعد میں انسان پہلے ہیں۔میری امی ایک آزاد انسان ہیں،جسے چاہے پناہ دیں اور جسے چاہے نکال دیں۔ہمارا مقابلہ ہندوؤں سے نہیں ہے۔ہمارا مقصد مسلمانوں کی بھلائی ہے۔ہندو اتنے برے نہیں ہیں۔۔۔"

"آگیا آپ کے اندر کا براہمن باہر۔"لکھنؤ کے شاہ وزیر خان نے طنز کیا تھا۔کامل کے جبڑے بھینچ گئے۔ہاتھ کی نسیں پھڑکنے لگیں۔اسکے بس میں ہوتا تو یہاں بیٹھے تمام لوگوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا۔لیکن کس بنا پہ۔حق پہ تھے وہ لوگ۔

"کامل صاحب ہمارے مسلمانوں کی فکر ہم خود کر لیں گے، آپ جائیں اور بنارس کے برہمنوں کی فکر کریں۔۔"اور اسکے بعد کامل نے تمام کرسی نشین کو ایک ایک کر کے اٹھتے،اور اس کمرے سے باہر جاتے دیکھا۔وہ تہی دامن تھا۔دہلی کی سازشوں نے اسکے اپنوں کو اس سے بد زن کر دیا تھا۔کم بخت دہلی،خون سفید کر دیتا ہے، تعلق مار دیتا ہے،اور دلوں میں فاصلے لے آتا ہے۔اس نے ہمیشہ سے یہی تو کیا ہے۔سلطانوں کو بھائیوں کے ہاتھوں مروا دیا،جائیدادوں کے پیچھے باپ بیٹے لڑوا دیئے،اور عورتوں کے عشق میں جنگیں کروائیں۔لیکن دہلی وہ بھی ہے جس نے لاکھوں لوگوں کو علم کی دولت دی۔بغیر کسی فرقے کی تفریق کے لوگوں کے سروں کو چھاؤں بخشی۔انسان اپنی سازش کا ٹوکرا کب تک ایک شہر کے سر پہ سجاتے رہیں گے؟

لوگ جا چکے تو کامل دھیرے سے کرسی پہ بیٹھ گیا۔اب کے اسکا رخ دھوپ کی طرف تھا۔کھڑکی سے خانوں کی صورت آتی دھوپ اسکے نقوش واضح کر رہی تھی۔گندمی رنگت، پر کشش نقوش، بھوری آنکھیں،ناک اٹھی ہوئی،اور ہونٹ کثرت سگریٹ نوشی کی وجہ سے ہلکے سیاہ پڑ رہے تھے۔بال سیدھے تھے،زلفیں کانوں سے ذرا سی ہی اوپر،چہرے پہ ہلکی داڑھی بھی تھی۔جو دھوپ لگنے سے چمک رہی تھی۔اگلے کئی لمحے کامل ہشام یونہی سر ہاتھوں میں گرائے بیٹھا رہا۔کتنے لمحے بیتے، کتنی گھڑیاں گزریں،اسے کوئی علم نہ تھا۔کئی لمحے بعد اس نے سر اٹھایا،دھوپ اب راستہ بدل چکی تھی۔کامل نے اپنے سفید کرتے کی جیب سے ایک خاکی لفافہ نکال لیا۔لفافہ کو ماتھے سے چاک کیا،تو اندر سے بھورے کاغذ نے اپنی جھلک دکھائی۔سست روی سے کامل نے کاغذ باہر نکالا۔وہ ایک خط تھا۔جس پہ لکھی سطور اب سامنے تھیں۔

سلام پیارے کامل۔

بنارس کی کوٹھی میں بیٹھ کر دہلی کے دفاتر میں خوار ہوتے،اپنے بیٹے کی خیریت دریافت کرتی ہوں۔دو ماہ ہوگئے،دنگے ختم ہو گئے،اب تو لوگوں کے زخم بھی بھر گئے،اور تم ہو کہ پلٹ کر خبر بھی نہ لی۔۔۔مسلم لیگ نے میرے بیٹے کو مجھ سے دور کر دیا۔شکایات اتنی ہیں کہ قلم ٹوٹ جائے،اور سیاہی خشک ہو جائے۔

خیر میں اس وقت شکایات نہیں کرنا چاہتی،ایک عرض بلکہ ایک حکم ہے۔یکم جولائی کو تمہاری چچازاد بہن کا نکاح ہے۔میں آج امرتسر کے لئے نکل رہی ہوں۔تمہاری پھپھو فرحانہ جبین

لاہور سے اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ امرتسر آ رہی ہیں۔ہاں تم صحیح سمجھے،تم انہیں ریل گاڑی کے اڈے سے لینے جاؤ گے۔جس دن تم دہلی سے امرتسر پہنچو گے،اسی دن تمہاری پھپھو، لاہور سے امرتسر پہنچ جائیں گی۔میری نند دس سال بعد مجھ سے ملنے آ رہی ہے،کامل کسی قسم کی کوتاہی نہ ہو۔

پھپھو کی تصویر ارسال کر چکی ہوں،ریل گاڑی کی تفصیلات بھی خط کے اختتام میں درج ہیں۔جلد آنا بیٹے۔ایک بار پھر یہ عرض نہیں حکم ہے۔

خدا حافظ۔

کامل کی آنکھیں اب کے بے تحاشا جلنے لگیں،جماعت کے جھمیلے کیا کم تھے؟ جو اب یہ الگ عذاب گلے پڑ گیا۔لیکن کچھ تھا اسکے چہرے پہ،بے بسی بھرا۔یوں جیسے اپنی ماں کو انکار کرنا اسکے لئے دنیا کا سب سے مشکل کام ہو۔گہری سانس ہوا کے سپرد کرتے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔چاک ہوئے لفافے سے ایک مڑی تڑی بوسیدہ سی تصویر برآمد کی۔تصویر کے عقب میں کچھ تفصیلات درج تھیں۔

ایک عورت، بمع دو بچیاں۔

ہاتھ میں نیلا ٹرنک۔

جعفر ایکسپریس،بوگی نمبر بارہ۔

☆☆☆☆☆

آج

ریل گاڑی امرتسر کو جانے والے راستے پہ روانہ تھی۔بوگی نمبر بارہ میں اس وقت آٹھ لوگ تھے۔گل رعنا،فرحانہ اماں،اور نوری۔رعنا کی چھوٹی بہن۔اور باقی کی عورتیں غیر شناسا تھیں۔دوپہر سر پہ تھی،کئی لوگ اونگھ رہے تھے،توکئی کی آنکھیں بند تھیں،دماغ تاریک،اور کئی اس وقت اپنے اپنے کھانے کے ڈبے نکالے،پیٹ کا دوزخ بھرنے میں مصروف تھے۔انہی لوگوں میں گل رعنا بھی تھی۔ سیاہ برقعے میں ملبوس،چہرہ کھولے وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں خفگی لئے اماں کو دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہوتا اگر آج آپ نے گوشت پکایا ہوتا۔لیکن نہیں،ان ہری بھنڈیوں کا عذاب ہمارے سر سے کہاں اترے گا؟"وہ سخت نالاں تھی۔ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا لئے بیٹھی،وہ اماں کو گھور رہی تھی،ساتھ جتا رہی تھی کہ گل رعنا بھوکی مر جائے گی،سادہ روٹی کھا لے گی۔لیکن ان ہری بھنڈیوں کو ہاتھ نہیں لگائے گی۔

"نہ مجھے یہ بتا بھلا سفر میں بھنڈی کھاؤ یا گوشت فرق کیا پڑتا ہے۔اور ویسے بھی مرغی ایک روپے کلو ہوگئی ہے،اب تو تب ہی پکے گی،جب مراد واپس آئے گا۔"انہوں نے کہتے ساتھ نوالا چبایا۔

"فرق پڑتا ہے اماں۔۔۔بہت فرق پڑتا ہے۔جب نوری بڑی ہوگی،اور میں اسے لاہور سے امرتسر جانے کا قصہ سناؤں گی۔تو کیا کہوں گی؟لاہوری رعنا نے ریل گاڑی میں بیٹھ کر،بھنڈی کھائی؟نہ مرغ مسلم، نہ قورمہ، نہ نہاری، نہ پائے۔اماں آپ نے لاہوری ہونے سے غداری کی ہے۔"وہ ہمیشہ کی طرح لمبی کھینچ کر بولی۔"اور مراد تب لوٹے گا جب پاکستان بنے گا۔اسے سکون سے آنے دے

اماں، آنے والی کی راہ میں آنکھیں نہیں لگا لیتے،ورنہ سفر لمبے ہو جاتے ہیں،آنکھیں تھک جاتی ہیں اور،دل پھٹ پڑتے ہیں۔آنے والوں سے امیدیں نہ لگائیں اماں۔۔آنے والوں کو انکی مرضی کرنے دیں۔"

"یہ جو ناول پڑھ پڑھ کر تیری زبان چلنے لگ پڑی ہے،اسے تو بند کرواتی ہوں میں۔ذرا واپس چلنا لاہور۔"اماں نے اسے گھر کا تھا۔گل رعنا ایک بار پھر ناراض ہو چکی تھی۔جبکہ نوری ان دونوں سے بے نیاز خواب خرگوش کے مزے لے رہی تھی۔اگلے دو گھنٹے میں ریل گاڑی امرتسر کے اڈے پہنچ چکی تھی۔مسافر اتر رہے تھے۔سرخ لباس والے، کُلی،لوگوں کا سامان اپنے کندھوں پہ ڈھو رہے تھے۔کوئی کسی قریبی کو دیکھ کر خوش تھا،توکسی کی آنکھیں اپنوں کو دیکھ کر مسرت سے نم ہوئی جاتی تھیں۔گل رعنا سیاہ برقعے میں ملبوس تھی،یوں کہ چہرے کے آگے سیاہ کپڑا سہرے کی صورت آتا تھا،جالی دار کپڑے کو اس نے ڈھاٹے کی صورت کان کے پیچھے اڑس لیا،یوں کہ اب بس اسکی آنکھیں نظر آتی تھیں۔بڑی بڑی سیاہ خوبصورت آنکھیں۔وہ جن سے گل رعنا امرتسر کا تفصیلی جائزہ لے رہی تھی۔ جبکہ اماں آس پاس نظر دوڑا رہی تھیں،کامل انہیں لینے آیا ہوگا،مگر ہے کہاں؟

بھانت بھانت کی بولیاں،لوگوں کا بے پناہ رش،اور کہیں دور سے آتی بھولی بسری کھانے کی خوشبو لاہوریوں کے اعصاب پہ بھاری پڑ رہی تھی۔یہاں سے ذرا سے فاصلے پہ کامل ہاتھ میں ایک سفید سیاہ تصویر لئے،لوگوں کے چہرے دیکھتا،شناسا چہرے تلاش کر رہا تھا۔اسی لمحے اسکی نظر بوگی نمبر بارہ کے داخلی دروازے سے نکل کر آتی گل رعنا پہ پڑی۔وہ ہر آتے جاتے کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ساتھ

ساتھ اپنی ماں سے کچھ کہہ بھی رہی تھی۔یہاں سے اسکی آواز نہیں آتی تھی،لیکن اسکے یوں لگتا تھا وہ غصے میں ہے۔

"اماں آپ کو چاہیے تھا پتہ پوچھ لیتیں،اب دیکھیں نہ بھلا کیسے منہ کھولے کھڑے ہیں ہم۔اب نوری کو کیا کہانی سناؤں گی؟یہ کہ امرتسر کے ریل اڈے پہ پون گھنٹہ انتظار کیا تھا۔ہنہہ۔"

"رعنا،دیکھ میرا دماغ خراب مت کر،کامل بڑا اچھا اور سلجھا ہوا بچہ ہے۔اس کی اماں نے کہا ہے وہ ہمیں بحفاظت لے آئے گا۔وعدہ کیا ہے میری بھابی نے نباہ کرے گی۔"اماں کا لہجہ مدبرانہ تھا۔

"اماں یہ امرتسر والے بس باتیں کرتے ہیں،وعدے نبھانا انکے بس کی بات نہیں ہوتی۔"

"امرتسر والوں کا نہیں پتہ لیکن بنارس والے زبان سے نہیں پھرتے۔"اپنی دائیں طرف سے آتی آواز پہ گل رعنا جامد ہو گئی۔اماں نے اسے تادیبی نظروں سے دیکھا،اور آگے بڑھ کر کامل کے سر پہ شفقت سے ہاتھ رکھا۔کامل ہنوز گل رعنا ہی کو دیکھ رہا تھا،یک ٹک پلک جھپکے بغیر،جبکہ رعنا کو وہ جگہ نہ ملتی تھی جہاں منہ چھپا لے۔پھپھو سے آداب،اور سفر کے احوال کے بعد وہ سفید کرتے والا مرد گل رعنا کی جانب مڑا تھا۔سنجیدگی سے اسے دیکھا،پھیل کر اسکے سامنے کھڑا ہوا اور "وعلیکم اسلام۔"بڑی سنجیدگی سے کہا۔

اب کہ رانا کا جی چاہا تھا،اسی بوگی میں بیٹھ کر دوبارہ لاہور لوٹ جائے،نہیں نہیں نہیں، یہ اسکی کہانی کا حصہ نہیں تھا۔یا خدایا اتنی سبکی؟

"اسلام علیکم کامل بھائی۔"اسکے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔کامل مسکرایا۔

"اماں بتاتی ہیں لاہور کے لوگ ادب،اور اخلاقیات سے مالا مال ہیں۔تم نے تو سلام ہی نہیں بھیجا رعنا۔"اس نے انتہا درجے کی معصومیت سے کہا۔رعنا شرمندہ سی کھڑی رہی۔اور پھر کامل نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں آگے آگے چلنے کو کہا۔مرتے کیا نہ کرتے کے مصداق رعنا اسکے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔کامل نے انہیں ڈبیا جیسی چھوٹی **(پچھلے ماہ ہی ابا کی زمین کے بیانے سے خرید کر لائی گئی)** گاڑی میں پچھلی نشست پہ بٹھایا،اور خود آگے آ کر بیٹھا۔

نیلا ٹرنک رعنا کے پیروں کے قریب رکھا تھا۔گاڑی امرتسر کی سڑکوں پہ رواں دواں تھی۔گل رعنا کو اعتراف کرنا پڑا کہ اسے اپنی کہانی میں چند مناظر گھٹانے ہوں گے، ہاں وہی چند جن میں کامل کے سامنے اسکی سبکی ہوئی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

امرتسر مختلف ثقافتوں کا گڑھ ہے۔سکھوں کے لئے اس شہر کی بڑی اہمیت ہے،تو مسلمانوں نے یہاں کئی برس گزارے ہیں۔فن تعمیر کا اعلیٰ ذوق لئے ہندوستان کا یہ قدیم شہران دنوں قتل و غارت ،سازشوں کا مرکز بن کر رہ گیاتھا۔بھائی چارہ ختم ہو چکا تھا،اب جو بچا تھا مقابلے بازی اور انا کے وار تھے۔کون جیتا کون ہارا فیصلہ مشکل تھا۔

گاڑی امرتسر کی سڑکوں پہ ہچکولے کھا رہی تھی۔رعنا کی عقابی نظریں ایک ایک دکان،ایک ایک ٹھیلا،ایک ایک آدمی،عورت سب کو جانچ رہی تھیں۔ذرا کہیں سے جو کھانے کی خوشبو اسکے ناک کے نتھنوں سے ٹکراتی تو اسکا جی مچل جاتا۔کئی بار تو جی چاہا تھا ذرا دیر کو رک کر یہ سیخ کباب خرید لے،ذرا یہ تکے ہی خرید لے اور پھر نان کے ساتھ کھائے۔لیکن اگلے ہی لمحے اسے یاد آجاتا کہ وہ لاہور نہیں

امرتسر میں ہے۔"کمبختوں نے جانور کو تکبیر بھی دی ہوگی کہ نہیں۔" ہر خیال کو وہ بس اسی خاطر جھٹک دیتی تھی۔ گاڑی اپنی مخصوص رفتار سے چلتی ہوئی بلاخر پون گھنٹہ بعد ایک مٹیالی حویلی کے باہر آ کر رکی۔ رعنا نے گاڑی سے باہر سر نکالا۔ بلند، عالیشان حویلی اپنی تمام تر شان کے ساتھ کھڑی تھی۔ دیواریں ایسی اونچی تھیں کہ گردن اٹھا کر دیکھنا پڑے، گھر کے اندر سے جھانکتے سبز دیو قامت درخت سارے امرتسر کی سن گن لیتے تھے۔ مسلم لیگ کے جوانوں کے نعرے سنتے تھے۔ اور کانگریسیوں کی نئی چالیں دیکھتے تھے۔ لیکن کیا ستم تھا کہ لب سیئے ہوئے تھے۔ آنکھیں دیکھی بھالی نابینا تھیں۔

"محترمہ گھر آ چکا ہے۔" آواز تھی کہ صور گردن اٹھائے حویلی کو دیکھتی گل رعنا فوراً ہوش میں آئی تھی۔ نقاب درست کرتی وہ گاڑی سے باہر نکل آئی۔ **(صد شکر دروازہ کامل نے کھول دیا تھا، ورنہ ایک بار پھر سبکی اٹھانی پڑتی۔)**

نیلی ٹرنک اب ملازم کے سر پہ تھی۔ اماں آگے بڑھ رہی تھیں۔ نوری اور گل رعنا دھیرے دھیرے قدم اٹھا رہی تھیں۔ رعنا تو خیر ایک ایک شے پہ اپنا گہرا مشاہدہ کر رہی تھی۔ **(کہانی کار تھی وہ۔)**

پتھریلی روش پہ چلتے ہوئے گل رعنا کو یہ حویلی بڑی معتبر معلوم ہوئی۔ لیکن لاہور والی بات نہیں تھی۔ فرحانہ جبین کے دونوں بھائی یعنی رعنا کے ماموں اچھے خاصے دولت مند تھے۔ رکھ رکھاؤ شان و شوکت کا تو پھر کوئی مول ہی نہیں تھا۔ روش کے دونوں اطراف میں پھیلی سبز گھاس اور کیاریوں سے جھانکتے رنگین پھولوں نے رعنا کو خوش آمدید کہا تھا۔ روش سے راہداریاں، راہداریوں سے پھر ساری حویلی لتاڑ کر بلاخر اب وہ تین خواتین مہمان خانے میں تھیں۔ حویلی میں ہر طرف لوگ ہی لوگ پھیلے تھے۔ کہیں لالا کرشن چندر سرخ، سبز، نیلی اور نہ جانے کتنے رنگوں کی ساڑھیاں بکھرائے بیٹھے تھے۔ اور

مہمان خواتین جن میں خرید نے والی کم اور نقص نکالنے والی زیادہ تھیں۔بس ناک بھنوئیں چڑھا لیتی تھیں۔

کہیں منشی نوید حسین اپنی دکان کی سب سے حسین مالائیں،کڑے،اور گلو بند کے نمونے دلہن کی ہمشیراؤں کو دکھا رہے تھے۔پیلے سونے پہ لکھنوی نمونے،اور دہلی کی میم صاحبوں کے زیور والے نقش نگار۔عورتوں کے دل سے ہائے جو نہ نکلتی تو نا انصافی ہوتی۔

رعنا مہمان خانے کی کھڑکیوں سے ساری حویلی کے نظارے کر رہی تھی۔نوری اس کے عقب میں کھڑی تھی۔گو کہ اماں کئی بار اسے صلواتیں سنا چکی تھیں۔لیکن جس دن گل رعنا نے لوگوں کی باتوں پہ کان دھرنا شروع کر دیا،اس دن سورج مغرب سے نکلے گا۔اور کیا پتہ کہ مارے حیرت کی زیادتی کے نکلے ہی ناں؟

"اماں۔۔۔۔یہاں تو کھلم کھلا تضاد ہے۔ماتھے پہ سرخ ٹیکے لگانے والوں سے سرخ ساڑھی خریدی جا رہی ہے۔وہ جن کے خلاف چند دنوں میں ہتھیار اٹھانے ہیں،ان سے گلے اور ہاتھوں کا زیور بنوایا جا رہا ہے۔۔۔اماں امرتسر والے نابینا ہیں؟یا پھر نانہجاز؟"وہ ہنوز کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھی۔ آنکھیں حیرت کی زیادتی سے پھٹنے کے درپے ہوئی تھیں۔

"گل رعنا۔۔۔کمبخت نیچے اتر۔کسی نے سن لیا تو بلا وجہ کی وضاحتیں دینی پڑ جائیں گی۔ملک کا بٹوارا ہو یا نہ ہو،تو میرے خاندان کا بٹوارہ کروا کے دم لے گی۔"

”ارے ارے۔۔۔ایسے کیسے نہیں ہو گا ملک کا بٹوارہ۔لاہور کی کنیت میں جب تک پاکستان کا نام شامل نہ ہوا، مجھ پہ آخری سانسیں حرام ٹھہریں۔“وہ چوکی پر سے اتر آئی۔”ویسے اماں آپ ناں جانتی نہیں ان امر تسر والوں کا خون سفید ہو گیا ہے۔ارے چند ایک دن میں بٹوارہ ہونے لگا ہے اور یہ اب تک پنڈتوں،اور پرسادیوں کو بغل میں دبائے بیٹھے ہیں۔۔میں۔۔۔"

”خون کا سفید ہونا،خون کے بہائے جانے سے بہتر ہوتا ہے گل رعنا۔“یہ اماں کی آواز کی طرح بے زار آواز نہیں تھی۔یہ کامل کی آواز کی طرح سنجیدہ آواز بھی نہیں تھی۔یہ مختلف آواز تھی۔اس میں حقارت تھی،اور سرد پن،سفاکی بھی۔گل رعنا نے گردن موڑ کر دیکھا۔چوکھٹ پہ وہ عورت کھڑی تھیں۔وہی جس کے ایک خط پہ کامل ہشام اپنے سارے کام کاج چھوڑ دہلی سے امر تسر آگیا تھا۔وہی جو اپنے شوہر کے ساتھ پنڈتوں کے محلے میں رہنے والی واحد مسلمان عورت تھیں۔وہ جسکا بیٹا پاکستان بنانے کے لئے اپنا خون تک بہا سکتا تھا لیکن،وہ ایک زمین کے ٹکڑے کے لئے خون بہنے نہیں دینا چاہتی تھیں۔چاہے ہندو کا خون ہو،چاہے مسلمان کا۔فریدہ ہشام کو یہ سرخ سیال بہانا،اور بہانے والے بلکل پسند نہیں تھے۔

”ایسے خون جو سفید ہو چکے ہوں۔انکا بہہ جانا ہی اچھا ہوتا ہے مامی جان۔“گل رعنا کی زبان تو پھر وقت کے آمر کے سامنے بھی نہ رکے۔کئی عورتیں فریدہ کے عقب میں تھیں۔راہداری میں گزرتا کامل بھی وہیں رک گیا تھا۔

”کسی انسان کا ناحق خون بہایا جانا گناہ کے زمرے میں آتا ہے،کیا تمھیں معلوم نہیں؟“

"اللہ نے انسان کی رگوں میں سرخ سیال ڈالا تھا،سب سے بڑی بے ایمانی تو یہ ہے کہ ہمارا لالچ،مفاد،یا پھر تکبر اللہ کے دیئے سرخ کو سفید کر دے۔ناحق یا پھر حق یہ فیصلہ زمین زادوں کا نہیں ہے مامی جان۔یہ اللہ کے فیصلے ہیں۔"وہ آنکھیں انکی آنکھوں میں ڈالے دیدہ دلیری سے کہہ رہی تھی۔

"بٹوارے کے نام پہ لوگوں کی جانیں،مال اور عزتیں لوٹ لینا۔ان اعمال کا فیصلہ یہیں ہوتا ہے رعنا زمین پہ،زمین زادوں کے ہاتھوں۔بٹوارے ہمیشہ بربادی ساتھ لاتے ہیں۔"کامل،اماں،نوری اور خاندان کی آتی جاتی عورتیں بلکل ٹھہر کر ساکن سی ان دونوں کو بولتے ہوئے سن رہی تھیں۔

"سہی کہا بٹوارے بربادی لاتے ہیں لیکن وقتی،اسکے بعد ایک سکون آتا ہے۔لمبا ٹھہراؤ۔وہاں جہاں آپ کی عزت نہ ہو،جہاں آپ کو حقوق برابر نہ ملتے ہوں،جہاں آپ کو ایک غیر قوم سمجھا جاتا ہو،کیا بہتر نہیں ہے وہاں سے کوچ کی جائے؟"

"اور کیا ہو کہ بٹوارہ سکون نہ لا سکے؟ٹھہراؤ مقدر نہ بن سکے۔اور کیا ہو کہ ایک الگ وطن،الگ خطہ بھی سکون کی ضمانت نہ بن سکے؟"

"پھر بیٹھ کے بخت کو کوسیں گے۔پھر لیٹ کے زخم کریدیں گے۔البتہ پچھتاوں کے ناگ پھر آپ کا جسم سبز نہیں کر سکیں گے۔"سیاہ آنکھوں والی لڑکی کے پاس ہر بات کا جواب موجود تھا۔

"رعنا بس کر جا۔" اماں نے اسکا بازو دبایا۔وہ رعنا ہی کیا جو اثر لے لے۔

"وہ جن لوگوں کے ساتھ صدیاں گزار دیں،اچانک ان سے ہی بٹوارہ کچھ عجیب نہیں لگتا۔جب انکے ساتھ صدیاں گزار دیں۔کیا اگلی چند صدیاں نہیں گزر سکتیں ؟"

اب کے رعنا ٹھہر گئی۔چوکھٹ پہ کھڑے کامل نے اسکا چہرہ غور سے دیکھا،اماں آنکھوں میں تنبیہہ لئے اسے دیکھ رہی تھیں۔گھڑیال کی ٹک ٹک،اماں اور کامل کی نظریں،کھڑکی سے آتی دھوپ،اور چند گھر میں بطور مہمان رکی عورتوں کی نظریں،ان سب کے درمیان گل رعنا مسکرائی تھی۔

"جب ایک آدمی درخت لگاتا ہے،تب اسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ درخت اسکی زندگی کے چند سال ہی اسے پھل دے گا،میوہ،چھاؤں دے گا۔لیکن کچھ عرصے بعد آدمی مر جائے گا،درخت یونہی تر و تازہ رہے گا۔پھر اسکی سالوں کی ریاضت کا کیا فائدہ؟" رعنا رکی،ایک اچٹتی نظر کامل پہ ڈالی۔

"درخت نسلوں کے لئے لگائے جاتے ہیں۔چھاؤں،میوہ،پھل،یہ سب اگلی نسل،اس سے اگلی نسل کے لئے ہوتا ہے۔بڑے بوڑھوں کو قربانیوں کی عادت ہوتی ہے۔قربانی انکا فرض ہوتی ہے۔انہوں نے چھاؤں کے بغیر زندگی گزاری،کیا اپنے بچوں کے لئے بھی یہی دھوپ چن لیں؟اچانک کچھ بھی نہیں ہوتا،ایک سالوں سے بھڑکائی گئی آگ ہوتی ہے،جو آتش فشاں بنتی ہے مامی جان۔"

فریدہ ہشام کی آنکھوں میں سرخی اتری تھی۔کامل کے چہرے پہ اب کے شانتی تھی۔اور اماں شرمسار سی کھڑی تھیں۔جبکہ نوری بے تاثر چہرے کے ساتھ ہر بات پہ غور کر رہی تھی۔

"آپ کہتی ہیں ان لوگوں کے ساتھ صدیاں گزر سکتی ہیں۔ جن کے ساتھ عقائد، کھانا، خوشی، اور غم نہیں بانٹا جا سکتا انکے ساتھ ملک بانٹ لیں؟ صدیاں لا شعور میں گزریں تو کیا اگلی کئی صدیاں بھی اسی طرح گزار دیں؟"

"تو تم کیا چاہتی ہو رعنا خون بہے؟" انکے لہجے میں طنز تھا۔

"اگر اس خون کے بہنے سے اگلی چند نسلوں کے خون بچ سکتے ہیں تو ہزار بار بہے۔"

"تم چاہتی ہو لوگ اپنی جائیداد، اپنے مال، اپنی عزتوں سے ہاتھ گنوائیں۔"

"اگر چند گنے چنے لوگوں کی جانیں، اگلی کئی نسلوں کی عزت، عقائد، مال، اور جائیدادیں بچا سکتے ہیں، تو ایسی ہزار میراث قربان۔" رکی باتر کی جواب دیتی وہ لوگوں کو حیرت میں ڈال رہی تھی۔

"اور یہ گنے چنے لوگ، قربانی کیوں دیں۔ وہ بھی اگلی نسلوں کے لئے۔" اب کے رعنا کی آنکھوں کی چمک ماند پڑی، وہ چند پل خاموش رہی۔ پھر جب بولی تو آواز مستحکم تھی۔

"آزادی قربانی مانگتی ہے۔ غزوہ بدر میں لڑنے والے تین سو تیرہ سپاہی اس لئے لڑے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے، انکی قربانی، انکا ایثار، انکا ایمان ایک وقت میں انہیں تین سو لاکھ بنا دے گا۔ قربانی دینے والے اللہ کی نظر میں معتبر ہوتے ہیں۔ یہ عقائد، نظریے، اور دین بچانے کی جنگ ہے۔ اس میں کیوں، کب، کہاں نہیں آتا۔ یہاں بس نعرہ تکبیر لگتا ہے۔ اور قربانیاں دے دی جاتی ہیں۔ ہر کوئی اس بات کو سمجھ نہیں سکتا۔ ہر کسی کے بس میں نہیں ہوتا کہ وہ اللہ کی نظر میں معتبر بنے۔"

رعنا خاموش ہوئی تو گویا امرتسر نے چپ کی چادر اوڑھ لی۔مٹیالے رنگ کی حویلی میں اب کوئی آواز نہیں آتی تھی۔سکوت۔گہرا سکوت۔

مجمع چھٹنے لگا،لوگ آگے بڑھ گئے۔بس ایک سکوت تھا جو ٹوٹتا نہیں تھا۔

☆☆☆☆☆☆

سنگھار میز کے سامنے بیٹھی گل رعنا کئی لمحوں سے اماں کی پھٹکار سن رہی تھی۔آنگن میں لوگ جمع ہو چکے تھے۔ڈھولکی کی تھاپ پہ گیت گاتی لڑکیوں کی آوازیں یہاں تک آتی تھیں۔رعنا کے ہاتھوں میں تالیاں بجانے کو کھجلی ہو رہی تھی۔بس ایک بار جو اماں چپ کر جائیں۔

"رعنا۔۔تو کیوں ایسی حرکتیں کرتی ہے۔جن لڑکیوں کی زبان لمبی ہو انکے رشتے نہیں آتے۔ آدھے خاندان نے آج تیری زبان کے جوہر سنے ہیں۔"

وہ سیاہ لباس میں ملبوس تھی۔بنارسی سیاہ جوڑا،جس کے دوپٹے پہ زردوسی کا کام ہو رکھا تھا۔گلے پہ ٹانکے سفید موتی رعنا کی مرہون منت تھے۔وہ اب کاجل کی تیلی آنکھوں سے گزار رہی تھی۔

"میں نے سوچا تھا،لاہور والے سارے رشتے دار کسمپری کی زندگی گزار رہے ہیں۔کم از کم ان امرتسر والوں کے پاس اچھا خاصا روپیہ پیسہ ہے۔اسی لئے تیرا رشتہ یہیں کر دوں گی۔میرے جانے کے بعد راج کرے تو رعنا۔۔لیکن تیری زبان کو کون سمجھے۔"

اس نے سیاہ کھلے بالوں کو کندھے پہ ڈالا اور سنگھار میز پہ رکھا ست رنگی پراندہ ہاتھوں میں لیا۔اور اب وہ اسے اپنے بالوں میں گوندھ رہی تھی۔بھرے بھرے گالوں پہ ہلکا سا غازہ بھی لگا رکھا تھا۔

”دیکھ رعنا میں یہاں سے جاتے ہی تیری ساری کتابیں جلا دوں گی۔پاکستان بنے یا نہیں، لیکن اگر تیری زبان اسی طرح چلتی رہی تو میرا آدھا خاندان جل جائے گا۔۔۔کئی بار منہ سی لینا چاہیے۔حق پہ ہوتے ہوئے بھی خاموش رہ لینا چاہیے۔یہ بزدلی نہیں،یہ مصلحت ہوتی ہے۔“

وہ اب اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔پیروں میں کولا پوری چپل ڈالے، پرا ندہ کندھے پہ ڈالا اور دوپٹہ سر پہ اچھے سے جمایا۔کانوں میں چاندی کی بالیاں چمک رہی تھیں۔گل رعنا اب تیار تھی۔اماں کی پھٹکار بھی اب بند ہو چکی تھی۔انکی بیٹی اب انکی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔نوری اس سارے وقت میں خاموش تماش بین تھی۔جب اسکی بہن بولتی تھی تب اسے سننا اچھا لگتا تھا۔

”اماں۔۔رعنا کی زبان وقت کے آمرین کے سامنے بھی نہیں رک سکتی۔جلا دے میری کتابیں۔بے شک سارا خاندان جلا دے۔لیکن میری ایک بات یاد رکھیں،رعنا جب تک زندہ ہے حق کی بات کہنا نہیں چھوڑے گی۔“

”رعنا۔۔۔تو کیوں ہے ایسی بتا مجھے،بھلا یہ پاکستان بن بھی جائے تو ہمارا کیا فائدہ۔آزادی مل بھی جائے تو ہمیں کیا ملے گا۔“انہوں نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر گل کو دیکھا۔”اچھا ٹھیک ہے۔میں تیرے پاکستان کے بارے میں کچھ نہیں کہتی،لیکن تو خاموش بھی تو رہ سکتی ہے ناں۔حق کے کلمے دل میں بھی تو دہرائے جا سکتے ہیں ناں؟“

گل رعنا نے کاجل سے بھری آنکھیں جھپکا کر اماں کو دیکھا۔

"میری آدھی سے زیادہ کتابیں اسلامی ہیں اماں۔۔۔میں نے بلال حبشی کا واقعہ پڑھا ہے۔جب انکا آقا انہیں تپتی ریت پہ لٹا کر انکے سینے پہ پتھر رکھ دیتا تھا۔اور کہتا تھا کہ پھر جاؤ حق سے،لیکن وہ پھر بھی احد احد کہتے تھے۔جانتی ہیں کیوں؟کیونکہ اسلام حق کا کلمہ کہنے کا حکم دیتا ہے پھر چاہے زبانیں کٹ جائیں،یا سر دھڑ سے الگ ہونے لگیں۔"

"وہ دور الگ تھا گل۔تب اسلام کی بقا کی جنگ تھی۔وہ لوگ اللہ کا پیغام لانے والے تھے۔یہ اقتدار،سازش کی جنگ ہے۔یہاں احد احد نہیں کہنا،یہاں لہو لہو کہنا ہے۔"

"یہ بھی دین بچانے کی جنگ ہے اماں۔آج ہندوستان میں ہمارے بچوں کو مندروں میں تعلیم دی جا رہی ہے۔سب کچھ ٹھیک ہو رہا ہے۔کل مسلمان لڑکے،ہندو عورتیں بیاہ لانے کو ٹھیک سمجھ لیں گے،ہندو لڑکے مسلمان عورتوں سے شادی کریں گے۔دین کا کیا ہو گا اماں؟ایک ہی گھر میں مسجد،مندر نہیں بن سکتی۔یہ بھی احد احد کہنے کا زمانہ ہے۔بس فرق یہ ہے کہ آج کوئی ظالم آقا نہیں،آج وہ اونٹوں کا زمانہ اور تپتی ریت نہیں۔" وہ کہتے ہوئے آگے آئی،پلنگ کی پائنتی پہ بیٹھی نوری کا ہاتھ پکڑ کر نیچے اتارا اور باہر کی جانب بڑھنے لگی،جب اماں نے اسے آواز دے کر روکا۔

"باقی سب کی خیر ہے۔لیکن فریدہ بھابی کے سامنے اپنی زبان بہت کم کھولنا۔کامل خاندان کا سب سے سلجھا ہوا،نیک اور سب سے زیادہ پڑھا لکھا لڑکا ہے۔اور سب سے بڑی بات مسلم لیگی ہے۔تیرے معیار پہ پورا اتر رہا ہے۔" چوکھٹ پہ کھڑی گل رعنا کئی لمحے سانس نہ لے سکی،وہ اماں کی بات نہیں تھی۔وہ سامنے کھڑا کامل تھا۔جو کاغذات کے پلندے ہاتھ میں لئے ہوئے تھا۔اور پھولوں کی لڑیاں

لگاتے لڑکے کو ہدایات دے رہا تھا۔ایک لمحہ،بس ایک لمحہ تھا۔اور گل رعنا کی نظر کامل ہشام کے لئے بدل گئی تھی۔

کیا ایک لمحہ کافی نہیں ہوتا؟

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

آنگن میں بچھی سرخ دریوں پہ اس سمے کئی عورتیں اور لڑکیاں بیٹھی تھیں۔شربت،چائے،گڑ کی ٹکیوں کے دور چل رہے تھے۔ہر سو چراغاں ہی چراغاں تھا۔حویلی کی سجاوٹ اور شان و شوکت آج رعب طاری کئے دیتی تھی۔دور پار شہروں سے آئی امیر،نواب شوہروں کی بیویاں کیا اعلیٰ لباس پہنے ہوئے تھیں۔کسی نے مہنگا ریشم اوڑھا تھا،تو کسی نے دبقے کے کام کے بھاری جوڑے پہنے تھے۔ہاتھوں اور گلے میں بھر بھر کر سونا ڈالا تھا۔گل رعنا انکی تیاری دیکھ عش عش کر اٹھی۔آج مایوں تھا۔اور چار دن بعد نکاح۔جب مایوں کے ٹھاٹھ یہ تھے،پھر نکاح پہ کیا غضب ڈھائیں گی۔فریدہ ہشام ایک اونچی کرسی پہ بیٹھی تھیں۔سامنے رکھی لکڑی کی چھوٹی میز پہ پاندان سجا تھا۔وہ شان سے مسکرا رہی تھیں۔البتہ رعنا سے انکی کوئی بات نہ ہوئی تھی۔خاندان کی لڑکیاں تالیاں پیٹ رہی تھیں،رقص کے لئے بلائی گئی چند میراثی عورتیں جھوم جھوم جاتی تھیں۔اسی لمحے گل رعنا کے ساتھ بیٹھی اماں نے اسے ٹہوکا دیا۔

”بھابھی بیگم کب سے تمھیں دیکھ رہی ہیں۔معافی نہ سہی اچھے سے سلام ہی کر لے۔“رعنا نے ایک کان سے سنی اور دوسرے سے نکال دی۔اماں کو جی بھر کے خار چڑھی، مگر ضبط کے گھونٹ بھرتی رہ گئیں۔وہ رعنا کی ماں تھیں ہار ماننا نہیں سیکھا تھا۔اب کے پینترا بدلا۔

"آج دوپہر میں نے چائے بنائی تھی۔بھابی کہہ رہی تھیں،لاہور میرے ہاتھ کے ذائقہ کھا گیا ہے۔"

اور بس گل رعنا کی ساری دنیا رک گئی۔اس نے گھوم کر اماں کو دیکھا۔رقص کرتی عورتیں،چائے،شربت،گڑ کی ڈلی سب جہنم میں گیا۔اماں نے اسکی حیران نظروں کو دیکھتے اضافہ کیا۔

"سہی کہہ رہی ہوں۔۔۔بھابی یہی کہہ رہی تھیں۔میرے جی میں آیا کہ ایک بار دوبارہ باورچی خانے کا رخ کروں،اور بھابی کی سوچ بدل کر رکھ دوں۔لیکن اب میری بوڑھی ہڈیوں میں اتنی جان کہاں۔" وہ نقاہت سے بولیں۔اور اب کے گل کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔وہ اٹھ کھڑی ہوئی،اور تن فن کرتی باورچی خانے کی جانب بڑھ گئی۔کانوں سے اب تک دھواں نکل رہا تھا۔

راہداریاں عبور کرتے ہوئے وہ باورچی خانے کی جانب جا رہی تھی۔چہرے پہ دبا دبا غصہ تھا۔شاہانہ باورچی خانے میں آ کر اس نے چولہے پہ چائے کا پانی چڑھایا،زردوسی کے کام والا ڈوپٹہ اسکے چلنے سے لہرا رہا تھا۔سیاہ بالوں کی لٹیں چہرے پہ جھول جاتی تھیں۔پانی ابلنے لگا تو اس نے غور کیا کہ پانی کچھ کم ہے،مٹکے سے ایک اور گلاس پانی بھرتے ہوئے وہ جونہی مڑی،چوکھٹ پہ ایستادہ کامل ہشام کو دیکھ وہ بوکھلا گئی،اسی لمحے فرش پہ رکھی چوکی سے اسے ٹھوکر لگی۔ گلاس میں بھرا پانی اچھل کر کامل کے ہاتھ میں موجود کاغذات پہ گرا۔کچھ کچھ چھینٹیں اسکے چہرے پہ بھی گری تھیں۔وہ جو منہ کھولے کچھ کہنے ہی لگا تھا۔حق دق رہ گیا۔اسکے انتہائی ضروری کاغذات پہ لکھی سیاہی اب کسی حسینہ کے کاجل کی مانند بہے جا رہی تھی۔چند لمحے تو کامل کسی قسم کا ردعمل تک نہ دے سکا۔گل رعنا کا دل چاہا تھا اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹ لے۔کامل نے اب کے بھوری آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔لب بھینچ رکھے تھے۔آنکھوں میں سختی تھی۔

"تم لاہور سے آگئیں لیکن لگتا ہے اپنی آنکھیں وہیں چھوڑ آئی ہو۔ کبھی تمھیں سٹیشن پہ اپنا ماموں زاد کھڑا دکھائی نہیں دیتا، اور کبھی فرش پہ رکھی چوکی۔ گل رعنا۔ **(اس نے گل رعنا پہ زور دیا۔)** کیا سارے لاہوری ایسے ہوتے ہیں؟" اسکا لہجہ بلند نہیں تھا۔ لیکن رعنا کو واضح سختی محسوس ہوئی۔

"مجھ پہ چڑھ دوڑنے کی ضرورت نہیں ہے کامل بھائی۔ باورچی خانہ عورتوں کی میراث ہے۔ اب خطہ غیر میں آئیں گے تو گولہ باری تو ہوگی۔" اس نے آنکھیں گھمائیں۔ کامل نے ضبط سے اسے دیکھا۔

"پھر ہم مرد حضرات پانی پینے کے لئے کسی جوہڑ کی تلاش میں نکل جائیں؟ "

"جیسا آپ کو مناسب لگے۔" وہ بغیر کسی لگی لپٹی کے بولی تو کامل کے مانو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اسی لمحے چولہے کا پھڑپھڑاتا شعلہ بجھ گیا۔ گل رعنا نے چائے کی کیتلی اٹھائی، اور باہر جانے کو اپنے قدم موڑے۔ کامل چوکھٹ سے ہٹ گیا۔

"میری بات سنو۔۔۔" اس نے آگے بڑھتی رعنا کو پکارا۔ پکار ان سنی ہوگئی۔ "رعنا رکو۔" وہ آگے بڑھتی چلی گئی۔ "میں کہتا ہوں یہیں رک جاؤ۔" اب کے وہ ذرا سختی سے بولا۔ رعنا نے مڑ کر اسے دیکھا۔ یونہی اسکو دیکھتے ہوئے وہ چند قدم الٹے پیر پیچھے کو ہوئی۔ گویا جتا رہی تھی کہ اسکی بات نہیں سنے گی۔

"آپ کی کہی بات پہ، آپ کی بتائی جگہ پہ رک جاؤں۔ تو پھر گل رعنا کیسے کہلاؤں؟" آنکھوں میں معصومیت، آنکھوں میں مقابلے کی دعوت، کامل زور سے ہنس دیا۔ پھر سر کو نفی میں ہلایا۔ گل رعنا کے

دل کو کچھ ہوا تھا۔کوئی مرد آج تک ہنستے ہوئے اتنا خوبصورت نہیں لگا ہو گا۔کم از کم گل رعنا کو نہیں لگا تھا۔

”تم نے یہ کیسے کیا گل؟“ یکدم وہ حد درجہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔اسکی ہنستی آنکھیں اب کے مختلف تھیں۔

”تم نے ایک مجمعے کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا۔تم نے اتنی بہادری کہاں سے سیکھی۔“

گل رعنا سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔وہ بس اسے تکے گئی۔

”میں کئی سال سے مسلم لیگ سے وابستہ ہوں۔لیکن آج تک بھی اپنی اماں کے سامنے مسلم لیگ کی حمایت نہیں کر سکا۔میں آج تک انہیں پاکستان کا مقصد نہیں سمجھا سکا۔ تم نے یہ کیسے کر لیا گل؟“ وہ واقعی جاننا چاہتا تھا۔دیواروں سے لٹکتے فانوس اسکے چہرے کو چمکا رہے تھے۔وہ یک ٹک اپنے سامنے کھڑی لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔

”وہ لوگ حق کی بات کہتے ہوئے نہیں ڈرتے جنہیں اللہ پہ یقین ہوتا ہے۔مکمل یقین۔عزت اور ذلت دینے والا،روزی رزق دینے والے کا یقین۔اولاد،مال،شہرت،زندگی سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جس دن انسان کو یہ یقین آگیا اس دن انسان دیو،بشر،چرند،پرند،بارود،گولی،بھیڑیے،جادو،سب سے ڈرنا چھوڑ دے گا۔“

کامل دو قدم آگے آیا۔آنکھوں کی بے چینی مزید بڑھ چکی تھی۔

"اور اگر ان سب سے نہ ڈرتا ہو، پھر بھی حق کہنے سے ڈرتا ہو۔کیا ہو کہ اسے اللہ پہ مکمل یقین ہو، لیکن پھر بھی اسکی زبان، دل اپنے خیالات کا اظہار کرنے سے ڈرتے ہوں؟"

"پھر وہ انسان اپنے فیصلے سے خود بھی نالاں اور متذبذب ہے۔ہر فیصلہ اللہ اور اسکے دین کے حساب سے لینا ہوتا ہے۔اگر اپنے کسی فیصلے، کسی رائے کو سرعام کرتے ہوئے ڈرتے ہو تو صاف ظاہر ہے آپ کے دل میں کھوٹ ہے۔نمائشی انسان کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔اسے اپنے فیصلوں میں ثابت قدمی نہیں ملتی، محفل میں وہ لوگوں کی نظروں، اور نظریوں سے خوف زدہ رہتا ہے۔ اور تنہائی میں اپنے ضمیر کی ملامت سہتا ہے۔" وہ بول کر رکی کامل کے دھواں دھواں ہوتے چہرے کو دیکھا۔"میں جاؤں کامل بھائی؟"۔

"ہمم۔۔ہاں۔۔ہاں تم جاؤ۔" وہ گویا کسی خیال سے چونکا تھا۔رعنا چند پل یونہی کھڑی رہی، پھر وہ راہداریوں میں کہیں کھو گئی۔ بلکل کامل کے ذہن کی طرح۔کیا وہ نمائشی تھا؟کیا واقعی اسکے دل میں کھوٹ تھا؟فانوس کی روشنی میں کھڑا مرد کئی لمحے سوچتا رہا۔

☆☆☆☆☆☆☆

تقریب اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھی۔بیگمات نے اپنے گھروں کی راہ لی۔رشتے داروں نے ایک ایک کر کے اپنے اپنے آرام گاہ کی راہ لی۔کئی چچا،ماموں زادوں نے چائے کے دور چلائے۔حویلی کی چھت پہ رشتے داروں کے لڑکوں کا قیام تھا۔جہاں سے اب بھی ٹھٹھے لگانے کی آواز آتی تھی۔زرا زرا دیر بعد مسلم لیگ کے نعرے بھی بلند ہوتے، پھر اختلاف میں ڈوبے دبے دبے غصیلے لہجے سنائی دیتے۔ان سب سے بے نیاز گل رعنا اور کئی دوسری عورتوں کی چارپائیاں آنگن میں بچھی تھیں۔سخت حبس اور

گرمی تھی کہ سانس رکتا تھا۔گل رعنا چارپائی سے اٹھ بیٹھی۔پسینے سے شرابور نوری مسکینیت سے اپنی بڑی بہن کو دیکھ رہی تھی۔رعنا کو بے اختیار اس پہ ترس آیا۔وہ اپنی جگہ سے اٹھی،پیروں میں چپل اڑسے،اور پانی کے مٹکے کے قریب چلی آئی۔سر سے دوپٹہ اتارا،مٹکے سے تین بڑے بڑے گلاس بھرے اور دوپٹہ سارا گیلا کر دیا۔پھر اسکو نچوڑا،اور اپنی چارپائی کی طرف چلی آئی۔نوری اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔رعنا بھی مسکرائی۔گیلا دوپٹہ چت لیٹی نوری کے اوپر ڈال کر وہ اسکے قریب بیٹھ گئی۔ اب کے حبس زدہ ہوا،ٹھنڈی لگ رہی تھی۔نوری کے پیٹ میں گدگدی ہونے لگی۔

”آپا۔۔۔تم نوری کا اتنا خیال کیوں رکھتی ہو۔“دوپٹے کے پار سے نوری کی پتلی آواز سنائی دی۔گل رعنا اسکے ساتھ لیٹ گئی۔

”کیونکہ نوری میری پہلی قاری ہے۔کیونکہ گل رعنا کی ساری کہانیاں نوری کے لئے ہیں۔میں جہاں جہاں جاتی ہوں ناں وہاں وہاں سے کہانیاں سمیٹ کر لاتی ہوں۔جب تم بڑی ہو جاؤ گی،تو ان کہانیوں کو لکھنا۔“

”آپا۔۔۔یہ تو چوری ہوئی۔تمہاری کہانی ہے تم خود لکھو ناں۔“

”جھلی۔۔میں لکھ نہیں سکتی۔لکھنے والے لوگ اور ہوتے ہیں۔وہ جو لکھاری ہوتے ہیں ناں انکو اللہ کی طرف سے تحفہ ملا ہوتا ہے۔وہ کوٹھی نہیں دیکھتے۔اس کوٹھی کا رنگ روغن،نقش نگار دیکھتے ہیں۔ انسان نہیں دیکھتے۔اسکی آنکھیں،اسکے تاثرات،اسکے چہرے کے رنگ دیکھتے ہیں۔“ وہ رکی آسمان پہ ٹکیا کی مانند چمکتے چاند کو دیکھا۔”قدرت نہیں دیکھتے،اسکے پیچھے کے راز،اور کہانی دیکھتے ہیں۔کمبخت بڑے

گھنے ہوتے ہیں۔روتا ہوا انسان،اسکا غم نہیں دیکھتے اسکے اندر اپنے مستقبل کا کردار دیکھتے ہیں۔" وہ مسکرا رہی تھی۔اپنی کہانیاں اسے یونہی مسکرانے پہ مجبور کرتی تھیں۔

"آپا تمھیں کیوں لگتا ہے میں لکھاری بن سکتی ہوں۔"نوری کی آنکھیں نیند سے بھر رہی تھیں۔

"کیونکہ تمہارا مشاہدہ گہرا ہے۔کیونکہ تم حساس ہو۔اور کیونکہ تم آنکھیں پڑھ لیتی ہو۔اور چوتھا تم سوال بہت کرتی ہو، یہ چار چیزیں انسان کو لکھاری بناتی ہیں۔ایک عظیم لکھاری۔"

"وہ کیسے؟" نوری نے جمائی روکی،البتہ زبان پہ مچلتا سوال نہ روک سکی۔(**مستقبل کی لکھاری۔**)

"گہرا مشاہدہ لکھاری سے تفصیلات لکھواتا ہے۔جس کی بغیر مکالمہ ادھورا ہے۔حساس انسان دوسرے کے درد کو سمجھتا ہے۔اور درد کو سمجھے بغیر اسے لکھا نہیں جا سکتا۔اور سب سے اہم بات،درد کے بغیر کہانی بکتی نہیں۔" بولتے ہوئے رعنا نے کروٹ بدلی۔"جس انسان کو آنکھیں پڑھنے کا فن نہ آتا ہو،وہ سچ جھوٹ میں فرق نہیں کر پاتا،اور لکھاری کو سچ، جھوٹ معلوم ہونا چاہیے۔پھر وہ جسے چاہے سچ لکھے،اور جو چاہے جھوٹ۔" وہ بول کر خاموش ہوگئی۔نوری کی نیند سے بھری آنکھیں غنودگی میں ڈوب چکی تھیں۔وہ آخری جواب سنے بغیر سوگئی۔چھت سے آتی آوازیں اب تھم گئی تھیں۔شاید لڑکے سو گئے تھے۔گل رعنا نے گہری سانس لی،بازو آنکھوں کے اوپر رکھا۔یہاں سے چھت پہ محفل جماتے لڑکوں میں سے ایک آدھ دکھ جاتا تھا۔اسی لمحے گل رعنا نے ایک چہرہ دیکھا،وہی جس کی آنکھیں بھوری تھیں۔وہی جو خاندان کا پہلا مسلم لیگی تھا۔اور وہی جو خاندان میں سب سے زیادہ پڑھا لکھا تھا۔اسکے ایک ہاتھ میں لالٹین تھا،اور دوسرے ہاتھ میں کاغذات،جنہیں وہ منڈیر پہ رکھے مطالعے میں غرق تھا۔رعنا کئی لمحے پلک جھپکے بغیر اسے دیکھے گئی۔

اسی لمحے اس بھوری آنکھوں والے مرد کے عقب میں اسے کوئی اور بھی نظر آیا۔گل رعنا کی آنکھوں میں یکدم خوف اترا تھا۔اس نے کروٹ بدل لی،لیکن جسم پہ اب بھی نظروں کا ارتکاز محسوس ہو رہا تھا۔کچھ وقت کے لئے تقریب میں واپس جاتے ہوئے اسکا دل بوجھل تھا۔یہ کچھ دیر قبل کا ذکر ہے۔گل رعنا ہاتھ میں شربت کے گلاسوں سے بھری طشتری لئے بیٹھک کی جانب جا رہی تھی۔یہاں سے ملازمہ یہ گلاس اندر مردوں کے پاس لے جاتی۔وہ ابھی بیٹھک کے قریب ہی تھی کہ تین سے چار لڑکے اسے اسی طرف آتے دکھائی دیئے،انکے ساتھ اسکا خالہ زاد عباد بھی تھا۔جو کہ نظروں ہی نظروں میں اسے کھا جانے کی قسم لے چکا تھا۔ساتھ چلتے لڑکوں سے زیادہ تیز قدم لیتے وہ گل رعنا کے قریب آیا،جھپٹ کر طشتری اسکے ہاتھ سے لے لی۔اور اسے اندر دفعان ہونے کا اشارہ کیا۔موقع کی نزاکت دیکھ رعنا کچھ نہ بولی اور تیز تیز قدم اٹھاتی واپس جانے لگی۔ عباد نظروں سے اوجھل ہو چکا تو اس نے سکون کی سانس لی،اور لمبی راہداری میں ایک ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔اسے حویلی کے راستوں کا علم نہ تھا۔ورنہ یوں منہ اٹھائے نہ گھوم رہی ہوتی۔چند پل یونہی بیٹھے ہوئے گہری سانسیں لیتی رہی۔پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔دوپٹہ درست کیا،چہرے پہ ہاتھ پھیرا اور آگے بڑھنے کو قدم اٹھائے۔اسی پل کسی نے اسکا راستہ روکا تھا۔رعنا کا سانس جہاں تھا وہیں تھم گیا۔وہ اپنی جگہ جامد ہو گئی۔اسکے سامنے کوئی مرد تھا۔بیس بائیس کے ہندسے کو چھوتا،پر کشش نقوش والا لڑکا۔اسکے ماتھے پہ سرخ ٹیکا تھا۔

"میں کافی دیر سے تمھیں دیکھ رہا ہوں۔ آج کی تقریب میں سب سے حسین لڑکی تم ہو۔" رعنا وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ لیکن اسکے قدموں میں جان نہ تھی، زبان تالو سے چپک گئی تھی۔ متوقع ذلت نے اسکے کان بند کر دیئے تھے۔

"حویلی کے پیچھے ایک جگہ ہے، وہاں ملنے آؤ گی۔" وہ چمکتی آنکھوں سے کہہ رہا تھا۔ لہجہ دل فریب سا تھا۔ گل رعنا کی نظریں بس اسکے ماتھے کے ٹیکے پہ جم گئیں۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے گئی۔

"یہاں کیا ہو رہا ہے؟" سخت کھردری آواز پہ وہ لڑکا مڑا تھا۔ کامل آنکھوں میں بے پناہ سختی لئے اسے گھور رہا تھا۔ گل رعنا کی یہاں موجودگی اسکے اعصاب کو جھنجھوڑ گئی تھی۔

"میں نے پوچھا یہاں کیا ہو رہا ہے؟ گل رعنا اپنی اماں کے پاس جاؤ۔" وہ سختی سے غرایا۔

"کچھ نہیں ہو رہا کامل بابو۔ میں بس یہاں سے گزر رہا تھا۔ اور یونہی ان پہ نظر پڑ گئی تو رک گیا۔ مجھے لگا مدد کی ضرورت ہوگی۔" وہ اب بھی ڈھٹائی پہ جما تھا۔ گل رعنا کی آنکھوں میں آنسو بھرنے لگے۔ وہ دو مردوں کے سامنے موضوع گفتگو تھی۔ کامل آگے بڑھ آیا، رعنا کے عین سامنے۔ یوں کہ وہ اسکے پیچھے چھپ گئی۔

"آئندہ تم مجھے حویلی کے اندر مت نظر آنا ہریش ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

"ہم کوئی گرے پڑے نہیں ہیں نیہوتا (**دعوت نامہ**) ملا ہے جب ہی آئے ہیں۔ پرن تو (**البتہ**) آپ کا یہ غصہ سمجھ نہیں آیا ہمیں۔" ہریش کا باپ کانگریس میں اعلی عہدہ دار تھا۔ اتنا غرور تو بنتا تھا۔ کامل اسے جواب دیے بنا مڑا، اپنے عقب میں کھڑی گل رعنا کو دیکھا۔

"اپنی اماں کے پاس جاؤ،اور دوبارہ حویلی میں یوں مت گھومنا۔امرتسر میں آوارہ کتے بہت ہیں۔"وہ نرمی سے کہہ رہا تھا۔ہاں لیکن اسکے لہجے میں سخت سا عنصر بھی تھا۔رعنا اسکے پیچھے سے نکل آئی،اور پھر اس نے اپنے آپ کو اندھا دھند راہداریوں میں بھاگتے دیکھا۔

حال میں سارے مناظر چھناکے سے ٹوٹ گئے تھے۔رعنا نے ایک خوف زدہ نظر چھت پہ ڈالی اب وہاں ہریش نہیں تھا۔وہ پر سکون ہونے لگی،کامل اب بھی کاغذات پہ جھکا تھا اور کچھ دیر بعد وہ گہری سانسیں لینے لگی تھی۔اسے نیند آگئی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

امرتسر کی اس حویلی کو چھوڑ ہم کہانی کے دوسرے رخ کی طرف جائیں گے۔یہ رات کا پہلا پہر تھا۔ امرتسر کا ایک محلہ جو کہ مسلمان آبادی سے بھرا تھا۔وہاں ایک بیٹھک لگی تھی۔رائے بہادر صاحب کے گھر کی چھت پہ اس وقت محلے کے تمام گھروں کے سربراہان موجود تھے۔چارپائیوں پہ بیٹھے،کرتا شلوار والے مرد۔امیدوں سے بھرے چہرے۔اپنے سامنے کھڑے ایک مرد کی بات سن رہے تھے۔حقے کے کش لئے جا رہے تھے۔مشعلیں روشن تھیں۔اور چائے کی پیالیاں ہر ایک کے ہاتھ میں تھیں۔یہ وہ دور تھا جب مسلمان اپنی مہمان نوازی کے لئے مشہور تھے۔جب وہ دین پہ پیروی کرتے ہوئے،کسی کی مدد کرتے ہوئے اسکا دین دھرم نہیں دیکھتے تھے۔بس اللہ کی نظر میں سرخرو ہونے کے جذبے تھے،بس کسی کے کام آجانے کی خوشی تھی۔ان دنوں قتل و غارت گری عروج پہ تھی۔مسلمانوں کے محلے کے محلے برباد کیے جا رہے تھے۔گھروں سے فرش کو دھوتا پانی نہیں جسموں سے بہتا خون نکلتا تھا۔

"بھائیوں وقت آگیا ہے کہ کوچ کی جائے۔ہمارے بھائیوں کو مارا جا رہا ہے۔ہمارے ہی مسلمان بھائیوں کے گھروں میں لوٹ مار کی جا رہی ہے۔ایک بڑے نقصان سے پہلے ہمیں چاہیے کہ یہاں سے نکل جائیں۔" منڈیر سے ٹیک لگائے کھڑا شخص کہہ رہا تھا۔اسکا لہجہ جوشیلا تھا۔عزم مضبوط۔

" جانتا ہوں آپ سب نے یہاں اس جگہ کو اپنا وقت۔روپیہ اور جذبات دیئے ہیں۔لیکن ہم جس دھرتی جائیں گے۔انشاءاللہ وہ ہمارے اوپر مہربان ہوگی۔وہاں کے لوگ ہمارے ساتھ مساوات کا معملہ رکھیں گے۔وہ ہمارا ملک ہوگا ہمارا پاکستان۔" یہ ایسا وقت تھا کہ لوگوں کی آنکھیں پاکستان کا نام سن کر بھر آتی تھیں۔ایک آزاد دھرتی پہ جانے کا خیال انکے اندر جذبات بھر دیتا تھا۔لیکن کلیجہ چھلنی بھی ہوتا تھا۔ہندوستان انکا اپنا نہ سہی یہاں کے گھر ان کے اپنے تھے۔لوگ دشمن ہو رہے تھے لیکن دوست بھی تو یہی رہے تھے۔بٹوارہ صرف جان مال پہ ستم نہیں تھا۔یہ روح کا چھالہ بھی تھا۔

"کل صبح ہم قافلے کی صورت یہاں سے نکل رہے ہیں۔ہمارا پہلا پڑاؤ ہم کل ہی طے کریں گے۔لاہور پاکستان کا حصہ ہوگا۔ہم لاہور جائیں گے۔ضرورت کی چند اشیاہ اپنے ساتھ اٹھالیں، بیبیاں تیار کروائیں۔ہمارے قدم ایک مقدس سر زمین پہ پڑیں گے۔انشاءاللہ۔"

"انشاءاللہ۔"

"انشاءاللہ۔"

انشاءاللہ۔

نعرے بلند ہونے لگے اس بات سے باخبر کہ ہندوؤں کا محلہ جڑا ہوا ہے۔ سر کاٹے جا سکتے تھے۔ دھڑ جسم سے الگ کئے جا سکتے تھے۔ لیکن اس دور میں اگر کوئی مسلمانوں کے جذبے کو مات دے جائے۔ تو پھر سورما کہلائے۔

"صبح قافلے کے ساتھ چلنے والے لوگ اپنا نام لکھوا لیں۔ صبح کسی قسم کی تاخیر نہیں ہونی چاہئے۔" مرد اب بھی لوگوں کے حوصلے بڑھا رہا تھا۔ امید تھما رہا تھا۔ جب مجمعے سے ایک صدا بلند ہوئی۔

"پچھلے ماہ بنیے سے ادھار لے کر بٹیا کا جہیز بنایا ہے۔ اور ہمارا داماد پاکستان نہیں جانا چاہتا۔ بیٹی ہم یہاں نہیں چھوڑنا چاہتے جائیں تو کہاں جائیں؟" بوڑھے کی صدا میں کرب تھا۔

"ساری زندگی ہم دو بھائیوں نے محنت کر کے ایک کوٹھی بنائی۔ اب اکھاڑ کر پاکستان نہیں لے کر جا سکتے۔ کہاں جائیں کیا کریں کچھ سمجھ نہیں آتا۔ اگر پاکستانی بھی اپنے نہ ہو سکے تو ہمارے پاس کیا رہ جائے گا؟"۔ اب کے ایک ادھیڑ عمر مرد کی صدا مضمحل تھی۔

"ساری زندگی جو کچھ جمع کیا تھا وہ ساری جمع پونجی ایک دکان پہ لگا دی۔ اب کیا کریں کیا دکان کو بیل گاڑی میں لاد کر لے جائیں۔ آزاد زمین پہ جائیں گے جسم تو آزاد ہو جائے گا۔ پیٹ کی غلامی کا کیا کریں۔ جب یہاں کے ہندو اور سکھ اپنے نہ ہو سکے تو کیا مسلمان اپنے ہو جائیں گے۔ یہ باغی صدا تھی۔" منڈیر پہ کھڑا نوجوان مسکرایا۔

"آپ کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں ہے۔ چاہیں تو یہاں رہ جائیں۔ تاکہ آپ کی بیٹی کے لئے بنایا گیا جہیز کوئی سکھ لوٹ کر چلا جائے اور صرف جہیز نہیں۔ کیا معلوم کہ مال غنیمت میں آپ کی بیٹی بھی

لے جائے۔" کئی غیرت مند صدائیں بلند ہوئیں، غیض و غضب کا شکار ہوئے لوگ اس پہ چڑھ دوڑنے کو تیار ہوئے۔ لیکن وہ بولتا رہا۔

"نہ جائیں پاکستان کیا لگتا ہے پاکستان کو آپ کی ضرورت ہے۔ ہرگز نہیں۔ ارے دھرتی کتنے ہی سال غیر آباد رہ سکتی ہے۔ ایک نہ ایک روز وہاں لوگوں کے بولنے کی آواز اور قدموں کی آہٹ جنم لے ہی لیتی ہے۔ لیکن آپ اپنی کہیں۔ پاکستان نہ جا کر آپ شاید خود کو بچا لیں۔ نسلوں کا کیا؟ وہ تو یہاں رہ کر برباد ہوں گی۔ ڈرو اس وقت سے جب تمہاری بیٹی ایک ہندو سے بیاہ کرنے کا سوچے۔ اور بیٹے کی اولاد سکھوں میں سے ہو۔" لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو چکے تھے۔ سانس ساکن ہو گئی۔

"آج رہ جائیں یہاں دکان بچا لیں۔ کوٹھی کے محافظ بن جائیں۔ لیکن کل جانا ہو گا۔ بات آج کی ہے ہی نہیں بات کل کی ہے۔ ہماری حفاظت کا تو کوئی تعلق ہی نہیں۔ قربانیاں نسل بچانے کو دینی ہیں۔ شاید پاکستان آپ کا حال نہ سنوار سکے، لیکن پاکستان آپ کا مستقبل ضرور سنوارے گا۔ یقین رکھیں۔ پاکستان کو آپ کی ضرورت نہیں ہے آپ کو پاکستان کی ضرورت ہے۔ میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔"

اس نے بازو سینے پہ باندھے اور بولنے کا سماں باندھا۔ چائے کی پیالیوں کی آپس میں ٹکرانے کی آواز ، مشعل کی روشنی ، اور لوگوں کی سنتی سماعتیں۔

ان سب کی درمیان وہ کہہ رہا تھا۔ "ایک گھر میں ڈھیر سارے چوہے رہتے تھے۔ ایک دن وہاں کا مالک ایک بلی لے آیا۔ یعنی چوہوں کی موت۔ بلی اب جب چاہتی کسی بھی چوہے کو مار کر کھا جاتی۔ یہ سلسلا کافی وقت چلا۔ پھر ایک دن تمام چوہوں نے مل کر ایک حل سوچا۔ وہ بلی کے پاس گئے۔ اور کہا

کہ وہ یوں انکا خاندان ختم نہ کرے بلکہ یوں کرے کہ ایک معاہدہ کر لے، کہ وہ خود سے کسی کا شکار نہیں کرے گی۔اور چوہے ہر چند روز بعد اسے خود ایک شکار پیش کریں گے۔بلی کو یہ تجویز پسند آئی۔ وہ راضی ہوگئی۔یوں ہر چند روز بعد اس کے لئے ایک چوہا بھیجا جاتا اور وہ سیر ہو کر کھاتی۔ایک روز ایک ننھے چوہے کی باری تھی۔وہ اپنے خاندان اور رشتے داروں کی بزدلی اور بے بسی سے اکتا گیا تھا۔سو اس نے ایک حل سوچا۔وہ خوشی خوشی بلی کے پاس چلا گیا۔بلی تو تیار تھی فوراً سے اسے کھا لیا۔لیکن وہ اس کا آخری کھانا تھا۔چوہے نے بلی کے پاس جانے سے قبل زہر چاٹ لیا تھا۔"لوگ دم سادھ گئے۔کہانیاں حقیر لوگوں کی بھی ہوتی ہیں لیکن جو اسباق وہ سکھاتی ہیں وہ کسی صورت حقیر نہیں ہوتے۔"ایک چوہا،حقیر سا جانور اپنی قوم کے لئے قربانی دے گیا اور آپ ڈر رہے ہیں۔ہچکچا رہے ہیں۔موت تو آنی ہے آج نہیں دس، بیس، تیس سال بعد اٹل ہے یہ۔لیکن مندر کے گھنٹے،اور تلسی کی پوجا سنتے ہوئے۔سکھ اور ہندوؤں کے چاقو سے مرنے سے بہتر ہے انہی سکھوں سے شہید ہو جاؤ۔

کل صبح قافلہ آپ سب کا انتظار کرے گا۔یوں تو آپ سب میرے ساتھ ہیں۔لیکن یہ گنے چنے باغی ہم آپ کا بھی انتظار کریں گے۔"

محفل برخاست ہو گئی۔لوگ اپنے گھروں کو جانے لگے۔انہی لوگوں میں ماسٹر یوسف بھی شامل تھے۔لالٹین ہاتھ میں لئے وہ چوکنا نظروں سے سنسان گلی کے اطراف میں دیکھتے اپنے گھر کو جا رہے تھے۔دفعتاً کسی نے انہیں بازو سے کھینچ کر دیوار کی اوٹ میں لگایا۔وہ سہم گئے۔موت اپنے قریب نظر آنے لگی۔جامنی پگڑی والا سکھ انکے سامنے تھا۔لیکن اس کی آنکھیں نرم تھیں۔ماسٹر صاحب کے اعصاب پر سکون ہونے لگے۔

"اج سویرے پنج وجے ساری سکھ برادری، ایس محلے تے حملہ کرن والی اے۔اپنا سامان چکو،اپنے مسلماناں نوں خبر دار کرو،تے جتنی چھیتی ہو سکدا اے ایتھوں نکل جاؤ۔**(آج صبح پانچ بجے ساری سکھ برادری اس محلے پہ حملہ کرنے والی ہے۔اپنا سامان اٹھاؤ،اپنے مسلمان بھائیوں کو اطلاع کرو اور جتنی جلدی ہو سکتا ہے یہاں سے نکل جاؤ۔)"**

"اور تو ہمارا ہمدرد کیوں بن رہا ہے پرم ویر۔" ماسٹر صاحب کی آواز گیلی تھی۔پرم ویر کی آنکھیں کرب زدہ ہوئیں۔

"گرو جی کا پڑھایا پاٹ یہ بھول گئے ہوں گے میں نہیں بھولا۔تم لوگوں کے دھرم میں امن ہے،تے جھگڑا،فساد اپنا بھی دھرم نہیں۔" وہ کہتے ہوئے جہاں سے آیا تھا وہیں چلا گیا۔

ہندوستان کے ہر گلی میں اگر دس لوگ مسلمانوں کو مارنے کو تیار تھے تو ہر گلی میں ایک پرم ویر بھی تھا۔قومیں بری نہیں ہوتیں۔مذہب برے نہیں ہوتے۔یہ لوگ ہوتے ہیں جو شدت پسندی کو دھرم کا دین کا نام دیتے ہیں۔ورنہ قتل ہر دھرم میں گناہ ،اورفساد ہر دین میں جرم ہے۔

☆☆☆☆☆☆

رات کے آخری پہر جب سارے میں سیاہی چھائی ہوئی تھی،حبس زدہ ہوا اس پہر ہلکی پھلکی تھی۔جسم کو بھاتی فرحت بخش۔دور کہیں سے فجر کی پہلی اذان بلند ہوئی تھی۔گل رعنا نے پٹ سے آنکھیں کھول لیں۔اگلے کئی لمحات میں وہ تمھیں جائے نماز پہ بیٹھی دکھائی دے گی۔دعا مانگ کر اس نے جائے نماز لپیٹی،لالٹین اٹھایا۔اسے چائے کی طلب ہونے لگی۔لاہور میں ہوتی تو اس وقت چولہے کے سامنے

بیٹھی گاڑھی میٹھی چائے بنا رہی ہوتی۔امرتسر میں یہ سہولت بھی میسر نہ تھی۔اسے بے اختیار رنج سا ہوا۔وہ چھوٹے چھوٹے قدم لیتی چھت کی طرف جانے والے زینوں کی جانب چلی آئی۔چائے نہ سہی مطالعہ سہی۔سارے آنگن میں بچھی چار پائیوں پہ اس وقت بھی سب خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔رعنا زینوں پہ چڑھتے ہوئے ذرا اوپر چلی آئی۔وہ جونہی ایک منتخب کردہ زینے پہ بیٹھنے لگی،اسے زینوں سے ملحقہ دیوار میں ایک جالی دار بڑا سا روشن دان نظر آیا۔ابھی وہ یہاں سے باہر کچھ دیکھتی کہ یکدم اسے کچھ یاد آیا۔اسکا چنری والا ڈوپٹہ،اوہ خدایا اسکا دوپٹہ چھت پہ ٹنگا تھا۔وہ بھول کیسے گئی؟

دن میں تو اماں اسے چھت پہ پیر رکھنے نہیں دیں گی۔کہ دیواریں چھوٹی تھیں۔اور ساتھ والے گھر غیر مذہبیوں کے۔وہ دبے پاؤں اب اوپری زینے چڑھ رہی تھی۔اسی لمحے کوئی چھت سے نیچے آتا دکھائی دیا۔اسکی آنکھوں میں نیند بھری تھی،بال بکھرے ہوئے۔کامل ہشام گل رعنا کو دیکھ کر ٹھٹھک کر رکا۔یکدم اسے چھت پہ سوئے ہریش کا خیال آیا۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟سکون نہیں آتا ایک جگہ؟" نہ چاہتے ہوئے بھی وہ تلخ ہوا۔

"میرے سکون کو چھوڑ کر آپ کی بات کرتے ہیں۔کہیں قرار نہیں آتا آپ کو۔" وہ تنک کر بولی۔

کامل خون آشام نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے دو زینے نیچے آیا۔وہ اس سے مرعوب نہیں ہوئی تھی۔سو وہ دھیما پڑ گیا۔

”دیکھو گل۔۔۔تم یہاں مہمان ہو۔مہمان سکون سے ایک جگہ ٹک کر رہتے ہیں۔تمہاری اماں کتنی ناراض ہوں گی اگر انہیں پتہ چلا کل رات کیا ہوا ہے؟“کل رات کے بارے میں سوچ کر تو ایک پل کے لئے رعنا کی سانس بھی رک گئی۔

”میرا دوپٹہ ٹنگا ہے چھت پہ بس وہی لینے جا رہی تھی۔“اسکی دلیل کمزور تھی۔

”چھت پہ اس وقت آدھے خاندان کے لڑکے سو رہے ہیں،تم دوپٹہ لینے جاتی اچھی لگو گی؟“

”میں اچھی نہیں لگوں گی،لیکن اگر آپ میرا دوپٹہ اتار کر لے آئیں تو برے نہیں لگیں گے۔“ کامل کو لگا تھا اس نے کچھ غلط سن لیا تھا۔

”میں چھت پہ جاؤں؟اور زنانہ دوپٹہ اتار کر لاؤں؟میں کامل ہشام؟“ وہ سینے پہ انگلی رکھے بے یقینی سے کہہ رہا تھا۔

”دوپٹہ زنانہ ہی ہوتا ہے۔آپ نے کبھی کوئی مردانہ دوپٹہ دیکھا ہے کیا؟“ وہ معصومیت سے بولی۔ ”آپ جا رہے ہیں یا پھر میں جاؤں کامل ہشام صاحب؟“ اس نے کامل ہشام پہ زور دیا تھا۔اور پھر چند لمحہ گل رعنا کو گھورتے رہنے کے بعد کامل ہشام چھت پہ جاتا دکھائی دیا۔

”سرخ اور سیاہ رنگ کا دوپٹہ ہے۔چنری کے نمونے والا۔“ گل رعنا نے ہانک لگائی۔اگلے چند لمحوں میں کامل اپنے ہاتھ پہ دوپٹہ لپیٹے واپس آتا دکھائی دیا۔رعنا دل کھول کر مسکرائی تھی۔

"اب اگر تمھیں کسی قسم کی اوٹ پٹانگ حرکت کرتے دیکھا،تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا گل رعنا۔"اس نے دوپٹہ رعنا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ساتھ ہی ایک زینے پہ بیٹھ گیا۔فجر غالبا قضا ہو چکی تھی۔اس نے تھکی تھکی نظریں اٹھا کر اپنے سامنے کھڑی لڑکی کو دیکھا۔

"چائے ملے گی۔"

"اونہوں نہیں ملے گی۔" ٹکہ سا جواب۔

"اور یہ ستم کیونکر۔" وہ حیران ہوا۔گل رعنا کی آنکھیں چمکیں۔

"آپ ٹھہرے جوہڑ کے پانی کے عادی،اور ہمارے ہاں وہ میسر کہاں؟" اسکی بات پہ کامل زور سے ہنس دیا۔رعنا اسکے ساتھ ہنسی تھی۔ماحول ہلکا پھلکا ہو گیا۔

"تم سے نہیں جیت سکتا میں۔" اس نے ہنستے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگایا۔"کرتی کیا ہو تم۔کتنا پڑھی ہو؟" اب کے رعنا بھی اس سے چار درجے نچلے زینے پہ بیٹھ گئی۔لالٹین ان دونوں کے بیچ میں تھا۔ جسکی روشنی میں وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔

"پورے چھ درجے پڑھی ہوں میں۔اور آپ؟"

"بس چھ سے پہلے ایک لگا دو،اتنا ہی۔"کامل نے مسکرا کر بتایا۔رعنا تو دم بخود رہ گئی۔کامل ہشام سولہ درجے پڑھ چکا تھا؟

"کرتی کیا ہو۔"سوال دہرایا گیا۔

"شاعری سنتی ہوں،ادب پڑھتی ہوں۔اور گھر کے کام۔اور بھلا کیا کرنا ہے۔آپ کیا کرتے ہیں۔"
کامل نے گہری سانس لی۔پشت دیوار سے ٹکا دی۔اور بازو سینے پہ باندھ لئے۔وہ گل رعنا کو اسکی زندگی کا سب سے بڑا جھٹکا دینے کو تیار تھا۔

"میں مسلم لیگ میں ایک اعلی عہدیدار ہوں۔پچھلے سات سالوں سے۔" اور لاہور سے آئی وہ لڑکی جہاں تھی،وہیں تھم گئی۔اسکی آنکھوں میں یکدم بے پناہ عقیدت،عزت،اور احترام بھر آیا کہ کامل اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"اماں نے کہا تھا آپ مسلم لیگی ہیں مگر میں نے یقین نہیں کیا،اوہ میرے خدا آپ مسلم لیگ سے ہیں۔۔۔یقین نہیں آتا مجھے۔۔۔مجھے تو بس لگا تھا،اماں آپ کااور میرا رشتہ کروانے کے لئے۔۔" گل رعنا کی چلتی زبان یکدم تھم گئی۔کامل کے چہرے کا رنگ بھی بدلا تھا۔ جسے وہ کمال مہارت سے چھپا گیا۔گل رعنا کمسن تھی۔وہ نہیں۔

"تم نے مجھے بتایا ہوتا کہ تم میرا رشتہ دیکھنے آئی ہو تو میں ذرا سلیقے سے سامنے آتا۔اور بتاؤ پھر کیسا لگا لڑکا؟" وہ یونہی بازو سینے پہ باندھے ہلکے پھلکے لہجے میں بولا تو گل رعنا کھلکھلا کر ہنسی۔

"ویسا یہ طریقہ اچھا نہیں ہے۔تم مجھے دیکھنے آئی تھیں۔مجھے پتہ ہونا چاہیے تھا،چائے ہی لے آتا میں۔" وہ کہے جا رہا تھا اور رعنا پیٹ پہ ہاتھ رکھے ہنس ہنس کر دوہری ہو رہی تھی۔

"پھر بتاؤ گل رعنا۔۔میں کامل ہشام تمھیں شادی کے لئے پسند ہوں یا نہیں۔"

"بلکل نہیں،ذرا برابر نہیں۔" وہ اپنی ہنسی قابو کرتے ہوئے بولی۔

”یوں نہ کریں سرکار میں برباد ہو جاؤں گا، آپ مجھے ٹھکرا دیں گی تو میرے لئے رشتے نہیں آئیں گے۔ جن لڑکوں کا ایک رشتہ در سے پلٹ جائے انہیں ساری عمر کوئی نہیں پوچھتا۔“

”خدا کے لئے کامل بس کر دیں۔ اللہ میرے اللہ میں ہنس ہنس کر مر جاؤں گی۔“ وہ واقعی ہنسی کے دورے کے درمیان بامشکل بول رہی تھی۔ کامل بھی ہنس دیا۔

”پھر کیا میں پسند آگیا؟ مجھے پسند کر لو، میں اپنے کاغذات خراب کر دینے پہ غصہ بھی نہیں ہوتا۔“

”آپ بھی مجھے پسند کر لیں، میں آپ کے غصہ ہونے پہ بھی غصہ نہیں ہوتی۔“ وہ چمکتی آنکھوں سے بولی۔ کامل نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

”بڑی بے شرم ہو، اپنی شادی کی بات خود کرتی ہو۔“

”دیکھ لیں میری خوبیوں میں ایک اور اضافہ، پھر میں ہاں سمجھوں۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ لالٹین کی زرد روشنی میں وہ دونوں ایک دوسرے کو چند لمحہ دیکھتے رہے اور پھر زور سے ہنس دیئے۔

اگلے کئی پہر وہ دونوں یونہی زینوں کے درمیان، لالٹین کی روشنی میں باتیں کرتے رہے۔ صبح کی پو پھوٹی تو گل رعنا اٹھ کھڑی ہوئی۔ کہ اب گھر کی عورتیں یعنی فتنہ اٹھنے کو تھیں۔ کامل کو خدا حافظ کہہ کر وہ زینے اتر رہی تھی جب اسکی پکار پہ رکی۔

”ویسے اگر تمہیں واقعی مجھے پسند کرنا ہوتا، تو کس بنا پہ کرتیں؟“

”یہی کہ آپ مسلم لیگی ہیں۔“

”اور اگر نہ پسند کرنا ہوتا تو؟“

"یہی کہ آپ مسلم لیگی نہیں ہیں۔"

وہ کہہ کر رکی نہیں، تیز تیز زینے اترتی نیچے چلی گئی۔کامل اسکے جانے کے کئی لمحے بعد تک مسکراتا رہا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اگلے تین روز کمال کے پر سکون تھے۔فریدہ بیگم یونہی کھچی کھچی تھیں۔اماں انکے آگے پیچھے پھرتی تھیں کہ فریدہ بیگم کا خاندان پہ رعب تھا،وہ ناراض ہوتیں،تو آدھے خاندان کی ناراضگی مول لینی پڑتی۔کامل ان تین دنوں میں بس صبح فجر کے وقت واپس آتا،چند پہر آرام کرتا اور پھر وہی جماعت کی بھاگ دوڑ۔

ان تین دنوں میں وہ روز فجر سے لے کر صبح کی پو پھوٹنے تک گل رعنا سے باتیں کرتا۔وہ بچوں کی طرح مسلم لیگ کے ایک ایک رہنما کے بارے میں سوال کرتی تھی۔اور کامل ضبط سے جواب دیتا جاتا۔لالٹین انہیں بولتے ہوئے سنتا،چاند انہیں دیکھ کر اپنی روشنی بڑھا دیتا،حشرات دم سادھ لیتے کہ ذرا بھی غل نہ ہو۔یہ ڈھلتی شام کا وقت تھا۔آنگن میں چارپائیاں بچھی تھیں۔ عورتیں پاندان،اور حقے کے کش لے رہی تھیں۔چائے کے دور چل رہے تھے۔اور غیبت عروج پر تھی۔ محفل کی ملکہ فریدہ ہشام تھیں۔تمکنت اور غرور تو ان پہ ختم ہوتا تھا۔

"ارے میں تو کہتی ہوں یہ آزادی وازادی ایک نرا کھیل تماشا ہے۔یہ موئے انگریز ہندو مسلم بھائی چارے کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔" حلیمہ بیگم نے حقہ کا کش لیتے ہوئے کہا۔

"جب ہندو مسلم بھائی، بھائی ہیں ہی نہیں۔ پھر بھائی چارہ کہاں کا۔" لڑکیوں کے ٹولے سے سعدیہ کی آواز آئی تھی۔ گل رعنا کے ساتھ تین دن گزارنے کے بعد اب وہ بھی حق کا کلمہ کہتی تھی۔ اسکی ماں کو ہول پڑنے لگے تھے۔ البتہ فریدہ بیگم دلچسپی سے اسے دیکھے گئیں۔ "ہماری تہذیب و تمدن، ہمارا رہن سہن سب ان سے مختلف ہے۔ وہ لوگ قربانی کا گوشت نہیں کھائیں گے، اور ہم مندر سے آیا پارساد۔ پھر کاہے کا بھائی چارہ؟" اسکی بات پہ ہر عورت کو سانپ سونگھ گیا۔

"اور یہ سب کون کہتا ہے؟" فریدہ ہشام پکار اٹھیں۔ "قائد اعظم جو خود ایک عرصہ تک کانگریس سے منسلک رہے۔ یا پھر علامہ اقبال جو کہ لکھتے ہیں۔ سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا۔ دو انسان اور دو مختلف رائے، اعتبار کریں تو کس پہ کریں۔"

"اس پہ جو حق ہو۔" لڑکیوں کے ٹولے سے ٹھہری ہوئی آواز سنائی دی۔ گل رعنا خود کو بولنے سے باز نہ رکھ سکی تھی۔ "علامہ اقبال نے لکھا ہے سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا۔ صحیح لکھا ہے۔ دھرتی اچھی ہی ہوتی ہے، اچھے برے لوگ تو ہر جگہ ہوتے ہیں۔ ہم یہ تو نہیں کہتے کہ سارے ہندو برے ہیں۔ کیا کبھی قائد اعظم نے ایسا کہا کہ ہندو برے ہیں؟" اس نے سارے میں نظر گھمائی کوئی کچھ نہ بولا۔

"ہمارے عظیم رہنما ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ ہم مختلف ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ کہا کہ ہمارے درمیان فرق ہے، ہماری روایات جدا ہیں۔ اچھے یا برے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انکی رائے میں تضاد نہیں۔ نہ کبھی تھا۔ کل قائد اعظم کانگریسی تھے، کیونکہ انہیں لگا وہ جماعت حق پہ ہے۔ لیکن جلد ہی انہیں احساس ہوگیا کہ کانگریس حق تو دیتی ہے مگر صرف ہندوؤں کے۔ ہمیں انکی بات پہ شبہ کرنے کی

کوئی ضرورت نہیں کیونکہ انکے لفظوں میں کوئی کھوٹ ہے ہی نہیں۔" اسکی گردن فخر سے بلند ہوئی۔ فریدہ بیگم سپاٹ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"اللہ بڑے بڑے منصب، یہ لوگوں کا اندھا یقین یونہی ہر کسی کو نہیں دے دیتا۔ قائد اعظم کے پیچھے ہندوستان کے سارے مسلمان ہیں، ایک عظیم عزم ہے۔ آپ کو لگتا ہے، انکے ماضی کے کسی فیصلے کا ذکر ہمیں ان سے بد ظن کر دے گا؟ معذرت مگر ہم کانوں کے کچے، اور آنکھوں کے اندھے نہیں ہیں۔" آخر میں رعنا نے طنز کیا تھا۔ اب یہ بنتا بھی تھا۔

"آزادی رائے کا حق تو ہے ناں ہمیں گل رعنا۔ یا پھر وہ بھی چھینا جا رہا ہے، ملک کی طرح۔"

"یہاں کا تو نہیں معلوم، لیکن ہمارے پاکستان میں آپ کو یہ حق ہو گا۔" وہ ایسی بے نیازی سے بولی کہ عورتوں نے دبے دبے قہقہے لگائے۔ فریدہ بیگم بھی مسکرائیں، سرد سفاک مسکراہٹ۔

محفل ایک بار پھر شروع ہوئی، اب کے ملکی سیاست کو چھوڑ کھانوں پہ بحث چھڑ گئی۔ ہر ایک اپنے علاقے کی ذائقہ گنوانے لگا۔ ہر ایک کو اپنے ذائقے کی برتری کی خواہش تھی۔ فریدہ بیگم کافی دیر سے خاموش تھیں۔ انکا بتیس سالہ بیٹا بھی انکے سامنے بات کرنے سے کتراتا تھا۔ اور اٹھارہ سال کی گل رعنا انہیں ناکوں چنے چبوا رہی تھی۔

"گل رعنا۔۔ تمھارے لاہور کا پلاؤ کب کھلاؤ گی؟ کیا تم لوگ بس باتوں سے پیٹ بھرتے ہو، کھانے کو کچھ نہیں دیتے۔" رعنا مسکرائی۔ خلوص سے، اپنائیت سے۔

"حکم کریں ممانی جان۔ لاہوری نہ کھانا کھانے سے منع کرتے ہیں نہ کھلانے سے۔"

"پھر آج رات ہم تمھارے ہاتھ کا پلاؤ کھائیں گے۔کیا خیال ہے؟"

"ارے خیال چھوڑیں،ہاتھ دھو رکھیں،بھوک چمکا کر رکھیں۔ذائقہ تو گل رعنا کے ہاتھوں سے شروع اور اسکے ہاتھوں پہ ختم ہوتا ہے۔"وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔کئی ایک لڑکیوں نے اسکے ساتھ اٹھنا چاہا،لیکن۔

"ارے تم سب یہیں بیٹھو آج خالص لاہوری ذائقہ چاہئے مجھے۔تم لکھنوی،بنارسی سب مل نہ جایا کرو۔" انہوں نے ڈپٹ کر باقی لڑکیوں کو بٹھا دیا۔رعنا مسکراتی ہوئی چلی گئی تھی۔فریدہ ہشام کو ایک کمینی سی خوشی ہوئی۔چاہے معملہ کوئی بھی ہو اپنی چلا کر انہیں سکون آتا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

باورچی خانے میں آج اشتہا انگیز خوشبوؤں کا راج تھا۔کہیں کھیرے پلیٹ میں سجے ہوئے تھے تو کہیں رائتے کا ڈونگہ بھرا رکھا تھا۔کہیں سبز پودینے کی چٹنی تھی،تو کہیں اچار کی سجی تھالی۔گل رعنا دوپٹے کو کندھے سے گزار کمر پہ باندھے کھڑی تھی۔لمبے بالوں کی چٹیا اسکے ساتھ جھول جھول جاتی تھی۔ امرتسر کی گرمی نے اسکی حالت خراب کر رکھی تھی۔بالوں کی لٹیں گردن سے چپک گئی تھیں۔شام ڈھل چکی تھی۔اور کمبخت پلاؤ اب جا کر تیار ہوا تھا۔فانوس کی روشنی بھی بھلا کب تک ساتھ دیتی۔ اندھیرا اب گہرا ہونے لگا تھا۔

"کیا بنا رہی ہو گل۔" وہ آواز پہ چونک کر سیدھی ہوئی۔کامل ہشام چوکھٹ سے ٹیک لگائے تکان زدہ آنکھیں لئے اسے دیکھ رہا تھا۔ساتھ ساتھ مسکرا بھی رہا تھا۔

"یا تو گل رعنا کہیں، یا پھر رعنا یہ گل کیا ہوتا ہے۔یوں لگتا ہے آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔" وہ جھک کر بن چکے چاولوں کو کفگیر سے گھما رہی تھی۔دم سے اترے چاولوں کی خوشبو سارے میں پھیل گئی۔

"نہ میں رعنا کہوں گا،نہ گل رعنا یہ نام تو تمھیں ہر ایک نے دیا ہے۔میرے پاس کچھ تو انوکھا ہونا چاہیے۔" وہ بولتے ہوئے آگے آیا۔رعنا کے ہاتھ سے کفگیر لیا،اور اس پہ لگے چاولوں کا نوالا بنایا۔وہ اشتیاق سے اسے دیکھ رہی تھی۔کامل نے نوالا چبایا،اور پھر گل رعنا کو دیکھا۔وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔کامل نے اطمینان سے نوالا چبایا۔

"کیا لاہوری بغیر نمک والا پلاؤ کھاتے ہیں۔" بس ایک سطر کہی تھی اس نے اور گل رعنا کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر گئیں،اسے اپنی ساری محنت بے کار جاتی نظر آئی تھی۔چند لمحے تو وہ اسی صدمے میں رہی۔اور پھر یکایک بلند آواز میں رونا شروع کر دیا۔

"مجھ سے کوئی کام نہیں ہوتا۔۔۔میں کچھ نہیں کر سکتی۔۔۔میں بے کار ہوں۔۔۔میں پھوہڑ ہوں۔" گل رعنا کا راگ شروع ہو چکا تھا۔کامل بوکھلا ہی تو گیا۔رعنا اب بلند آواز میں خود کو کوس رہی تھی۔

"مجھے کوئی کام آتا ہی نہیں۔۔۔بس باتیں کروا لو۔۔۔یاد کیسے نہیں رہا مجھے۔۔۔اوہ میرے خدایا میں اب کیا کروں گی؟" وہ رو رہی تھی،وہ واقعی رو رہی تھی۔اب کے کامل کو برا لگا۔ایک تو وہ ابھی ابھی جماعت کے کاموں سے تھک کر آیا تھا۔

”آپ کی اماں نے اتنے سارے لوگوں کے درمیان دستر خوان سجا رکھا ہے۔اور میں؟میں نے سب برباد کر دیا۔“ وہ روتے ہوئے چوکی پہ بیٹھ گئی تھی۔

”گل۔۔اچھا اب رونا بند کرو۔اچھا یہاں دیکھو تو۔۔۔رونے سے کیا ہوگا؟دیکھو میرے پاس ایک حل ہے۔“ اب کے چوکی پہ بیٹھی گل رعنا نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔بھیگی بھیگی آنکھیں،کامل بس اسے دیکھ کر رہ گیا۔

”کیا حل ہے۔“ وہ زکام زدہ آواز میں بولی تو کامل مسکرایا۔اگلے کئی لمحات بعد کامل کے ہاتھ میں ایک پیالی تھی۔جس میں لبالب پانی بھرا تھا۔اور اب وہ نمک کے تین،چار چمچ بھر بھر کر اس پانی سے بھری پیالی میں ڈال رہا تھا۔پھر اسی چمچ سے نمک کو پانی میں حل کیا۔وہ اتنا مصروف،اتنا منہمک تھا کہ جس کی کوئی حد نہیں۔

”ڈھکن ہٹاؤ۔۔میں یہ پانی ڈالتا جاؤں گا۔تم چمچ چلاتی جانا۔ٹھیک ہے؟“ وہ جواب دیئے بنا آگے آئی ایک زوردار آواز کے ساتھ ڈھکن کو اٹھا کر نیچے پٹخا،اور کفگیر ہاتھ میں لئے کھڑی ہو گئی۔بے شک کامل کے پاس حل تھا لیکن رعنا کا خود پہ غصہ بھی بجا تھا۔

کامل آگے آیا دیگچے کے قریب جھک کر نمک والا پانی اپنی ہتھیلی پہ ڈالا،اور پھر سارے کا سارا چاولوں کے اوپر چھڑک دیا۔گل رعنا نے چمچ چلایا اب نیچے والے چاول اوپر تھے۔کامل نے ایک بار پھر ہتھیلی میں پانی لیا اور چاولوں کے اوپر چھڑک دیا۔اسی طرح اس نے ساری پیالی کا پانی چاولوں کے اوپر چھڑکا،اور ڈھکن اٹھا کر چاولوں کو ڈھک دیا۔آگ بجھ چکی تھی،اب دہکتے ہوئے کوئلے تھے جن پہ

چاولوں کو ایک بار پھر دم لگ رہا تھا۔گل رعنا اب کے ٹھہر کر کامل کو دیکھ رہی تھی۔سارے خاندان کے مرد ایک طرف اور وہ ایک طرف تھا۔

"آپ نے یہ سب کہاں سے سیکھا۔" وہ چوکی پہ بیٹھ گئی۔کامل اسکے قریب رکھی دوسری چوکی پہ بیٹھ گیا۔لالٹین کی روشنی آج بھی ان کے ہمراہ تھی۔

"انگلینڈ میں اکیلا رہتا تھا میں۔چار سال کی تعلیم کے دوران سب سیکھ گیا۔کہو تو کر کے دکھا دوں۔"

"کیا وہاں کوئی خانساماں نہیں تھا؟بھلا مرد خود کب سے کھانا بنانے لگے؟" کامل کا چہرہ سنجیدہ ہوا۔

"تھی ناں خانساماں نہیں،ایک انگریز لڑکی تھی۔ہر روز میرے لئے کھانے بناتی تھی۔بس میں کھاتا ہی نہیں تھا۔پتہ نہیں حلال ہو کہ حرام۔" اس نے ناگواری سے آنکھیں گھمائیں۔۔گل رعنا نہیں جانتی تھی کیا،مگر اسے کچھ برا لگا تھا۔وہ آج از حد سنجیدہ تھی۔

"اگر آپ کو مجھے پسند کرنا ہوتا تو کس بنا پہ کرتے؟" رعنا کو یاد آیا وہ آج شام کس طرح عورتوں کے درمیان جواب دیتی رعنا کو دیکھ رہا تھا۔اسکے انداز میں واضح ناگواری تھی۔رعنا کے دل کو دھکا سا لگا تھا۔

کامل اس سوال کا مقصد جانتا تھا۔ہاں یہ انتہائی بچکانہ حرکت تھی کہ وہ ہر فجر صبح ہونے تلک اس سے باتیں کرتا تھا،لالٹین کی زرد روشنی،چائے کی پیالیاں،اور ڈھیر سارے قصے۔لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ گل رعنا کے ساتھ اسکا کوئی مستقبل نہیں ہے۔اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا تو گل رعنا نے ایک بار پھر اسے پکارا۔

"اگر آپ کو مجھے پسند کرنا ہوتا تو کس بنا پہ کرتے۔"

"صرف اس بنا پہ کہ تم میری ماں کی تابعداری کرو۔حق پہ ہوتے ہوئے انکے سامنے خاموش ہو جاؤ۔"

"اور اگر نا پسند کرتے تو کس بنا پہ کرتے۔"

"یہی کہ تم میری اماں کی نا فرمانی کرو،انکے سامنے بولو،اور دس لوگوں کے سامنے بولو۔" وہ اسکی آنکھوں میں دیکھ کر بولا تھا۔رعنا ہنس دی۔

"آپ نے اس دن کہا تھا میں بہت بے شرم ہوں۔آج میں آپ سے کہتی ہوں،آپ کتنے بزدل ہیں۔" کامل نے بے یقینی سے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔"آپکی تو پسند نا پسند میں بھی آپ نہیں۔میں گل رعنا حق کی بات کروں گی،پھر چاہے میرے آگے کامل ہشام کی ماں ہو یہ پھر میری اپنی ماں۔" وہ بول کر اٹھی دوپٹے سے ڈھکن کو اٹھایا۔کامل بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔اور جانے کو اپنے قدم موڑے۔

"میں نے جھوٹ کہا تھا۔انگلینڈ میں کوئی لڑکی نہیں تھی۔"وہ چوکھٹ پہ کھڑا جواب کا انتظار کرتا رہا۔

"لیکن میں نے سچ کہا ہے۔آپ بزدل ہیں۔" وہ ترکی با ترکی بولی۔کامل نے کچھ کہنے کو لب کھولے پھر خاموش ہو گیا۔رعنا اب چاول چکھ رہی تھی۔ذائقہ واپس آ چکا تھا۔لیکن زندگی سے ایک ذائقہ

رخصت ہو رہا تھا۔نہ جانے کیوں مگر ہاں اسکا دل پسیجا تھا۔لیکن اس نے مڑ کر جانے والے کو ایک نظر بھی نہ دیکھا۔کیا جانے والوں کو نظر اٹھا کر دیکھنا چاہیے۔؟

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حویلی کی اوپری منزل پہ کئی کمرے بنے تھے۔یہاں گھر میں موجود مہمانوں کی رہائش کا انتظام تھا۔ ایسے ہی ایک کمرے میں قدم دھرو تو حویلی کی شان و شوکت آنکھیں خیرہ کرنے کو تیار تھی۔لکڑی کے اعلیٰ نقش و نگار والے پلنگ پہ فریدہ بیگم پیر لمبے کئے بیٹھی تھیں۔ہاتھ میں چائے کی پیالی تھی۔اور نظریں اپنے سامنے بیٹھی فرحانہ جیینپہ جمی تھیں۔

”پھر کیا سوچا ہے تم نے گل رعنا کہ ہاتھ پیلے کب کر رہی ہو۔“

”بھابی بیگم رعنا کے باپ کو تو آپ جانتی ہیں سب کچھ نشے میں اڑا چکا ہے۔بھائی فوج کی چاکری میں جت گیا ہے۔یہاں آئی تھی کہ سارا خاندان ہو گا کہیں بات ہی چلا دیں گے۔لیکن اللہ جانے رعنا کے بخت کیوں نہیں جاگتے۔آپ تو خاندان کی بڑی ہیں کہیں بات چلائیں ناں۔“وہ بڑی لجاحت سے کہہ رہی تھیں۔فریدہ بیگم نے ہنکارہ بھرا۔

”تمھیں کیسا لڑکا چاہیے۔“

”میری بات نہ کریں بھابی جان۔رعنا بہت منہ زور ہے۔پڑھا لکھا،اور مسلم لیگی نہ ہوا تو ہرگز نہیں ماننے کی۔“

"صاف صاف کہو ناں کہ اپنے بھتیجے کے لئے آس لگائے بیٹھی ہو۔میں تمہاری بھابی نہیں بہن ہوں۔ قباحت کیا ہے۔"

فرحانہ تو سن ہی رہ گئیں۔بے اختیار خود سے شرم آنے لگی۔ہاں مانا رعنا کا رشتہ انکی ضرورت تھی۔ لیکن یوں منہ سے کہنا برا لگتا تھا۔ہاں اپنا بھائی ہوتا تو الگ بات تھی۔

"کامل میرا اپنا بچہ ہے بھائی کا خون۔پڑھا لکھا،اور قابل۔لیکن میری اتنی اوقات نہیں ہے کہ میں اتنے اونچے خواب دیکھوں،بلکہ میں خواب دیکھ چکی ہوں۔مگر انکی تعبیر سے خوف آتا ہے۔" انکی گردن جھک گئی۔

فریدہ بیگم نے چائے کا ایک اور گھونٹ بھرا۔پھر گردن اٹھا کر سامنے والی عورت کو مخاطب کیا۔

"مجھے نہیں لگتا ایسے خوابوں میں کوئی برائی ہے۔کامل اعلی ہے،اونچا ہے تو کیا کوئی اسکے خواب نہیں دیکھ سکتا؟" اماں نے بے یقینی سے گردن اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"مسئلہ تمھارے خواب نہیں ہیں۔مسئلہ تمہاری بیٹی کی حقیقت ہے۔لمبی زبان کی لڑکیاں یا تو تین لفظ سنتی ہیں،یا پھر اپنے جنازے کی پکار۔مجھے رعنا کے تیور ٹھیک نہیں لگ رہے۔"

"آپ بڑی ہیں درگزر کر دیا کریں۔بلکہ آپ کہیں تو اسے کچھ ماہ آپ ہی کے پاس چھوڑے جاتی ہوں۔تربیت کر دیجیئے۔"

فریدہ بیگم مسکرائیں۔چائے کی پیالی تپائی پر رکھی،اور پر سکون سے چہرے کے ساتھ گردن نفی میں ہلائی۔

"اسکی تربیت تو اب کامل خود کرے گا۔میں اس سے بات کروں گی۔مجھے یقین ہے وہ میری بات مان جائے گا۔کامل ہشام کا دیا ہوا سبق وہ ساری زندگی نہیں بھول سکے گی۔"

"خوابوں پہ ہر ایک کا حق ہوتا ہے۔کسی انسان کو حق نہیں کہ کسی دوسرے کو خواب دیکھنے سے روکے۔"

اصل جھٹکا تو اماں کو اب لگا تھا،انہیں یقین نہ آیا کہ کیا کہیں۔کھانے کے لئے فریدہ بیگم کو بلا کر لانے والی رعنا کے کان بھی لمحے بھر کو سن ہوئے تھے۔وہ دروازے پہ کھڑی تھی۔متحیر،شل سی۔اس کے سامنے کامل کھڑا تھا۔آنکھوں میں سنجیدگی اور انجانے جذبات لئے۔وہ اندر ہونے والی گفتگو سے لا علم تھا۔

"یوں دروازے پہ کھڑے ہو کر کسی کی باتیں نہیں سنتے گل۔"وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔اور پھر بڑی دیر بعد کامل کی سماعتوں سے اس کی آواز ٹکرائی۔

"اگر میں حق کی بات پہ خاموش ہو جاؤں،تو کیا میں کبھی ثابت قدم رہ سکوں گی؟کیا میرا دل کھوٹ زدہ نہیں ہو جائے گا۔"وہ رکی،نم ہوتی آنکھوں سے کامل کو دیکھا۔"آپ نے سات سمندر پار کا سفر طے کیا ہے۔مجھے میرے سوالوں کا جواب دیں۔"

"دل کے معملے میں کسی اور سے جواب تلاش نہیں کرتے،بس دل پہ ہاتھ رکھو،آنکھیں بند کرو اور جواب تلاش کرو۔دل اپنے جواب خود دیتا ہے گل۔"وہ اندر چلا گیا۔رعنا نے آنکھیں بند کر لیں۔ہاتھ دل کے مقام پہ رکھا۔

”اے گل رعنا کے بے عیب دل۔۔۔کیا ہو کہ میں تجھے مار کر، تیری سچی باتوں کو جھٹلا کر زبان پہ قفل لگا لوں؟کیا ہو کہ میں حق کا کلمہ چھوڑ فانی دنیا کے گیت گاؤں؟کیا تو کھوٹ زدہ نہ ہو جائے گا؟ “

اور گل رعنا کے دل نے اپنا جواب کہہ سنایا تھا۔جواب کیا تھا کیا مجھے بتانے کی ضرورت ہے؟

☆☆☆☆☆☆☆

دو دن بعد۔

آج نکاح کی رات تھی۔لڑکیاں اپنے رنگ برنگے آنچل لئے تیار ہوئے آنگن میں پھر رہی تھیں۔مرد حضرات تو آج دعوتوں کے لطف اٹھا رہے تھے۔کامل آج صبح سے گھر نہیں آیا تھا۔گل رعنا کے دل میں اب بے قراری نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔وہ دھانی رنگ کے کرتا شلوار کے ساتھ گلابی رنگ کا دوپٹہ اوڑھے ہوئے تھی۔کانوں میں بڑے بڑے آویزے بال آج کھلے چھوڑ دیئے تھے۔جو کوئی اسکی بھوری رنگت،اسکی تیاری دیکھتا تھا بس دیکھتا ہی رہ جاتا تھا۔کامل نے صبح فجر کے وقت اسے بتایا تھا کہ وہ مہمانوں کی وجہ سے حویلی کے عقبی دروازے سے آئے گا اور سیدھا بیٹھک کی اور چلا جائے گا۔گو کہ اس نے رعنا سے کسی قسم کی ملاقات کی فرمائش ظاہر نہیں کی تھی،لیکن نہ جانے کیوں اور کس خیال کے تحت رعنا کے قدم عقبی دروازے کی طرف اٹھے۔نوری اسکے لئے پہرے دے رہی تھی۔ایک پل کو رعنا کو خود پہ حیرت ہوئی،وہ کوئی غلط کام کر رہی تھی کیا؟اور اگر نہیں تو ان پہروں کی کیا ضرورت۔۔آج حویلی کی جھب ہی نرالی تھی۔چراغاں ہی چراغاں ہر سو تھا۔وہ دبے دبے قدم لیتی ہوئی عقبی دروازے کی اور چلی آئی،یہاں کوئی نہیں تھا۔سر سبز گھاس بچھی تھی۔اور اس پہ چند

کرسیاں رکھی تھیں۔البتہ یہاں روشنی کم تھی۔اور کاٹھ کباڑ زیادہ۔دروازہ کھلا تھا،کہ کچھ مرد حضرات جن سے گھر کی عورتوں کو پردہ کروانا تھا،انکا یہاں سے گزر ہو سکے۔رعنا دروازے کے قریب رکھی ایک پرانی الماری کی اوٹ میں کھڑی ہو گئی۔کئی پل بے تابی میں گزرے،کئی لمحے بے قراری کی نظر ہوئے۔اور تب ہی اسے چٹخنی کھلنے کی آواز آئی۔دروازہ اپنی مخصوص آواز کے ساتھ کھلا،رعنا کا دل اچھل کر حلق میں آیا تھا۔وہ یونہی کھڑی رہی،ساکن بے سانس۔اور اسی پل اسے اپنی کلائی کسی سخت گرفت میں محسوس ہوئی۔اس نے پلٹ کر دیکھا۔اور پھر اسکا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

مسکراتی نظروں سے اسے تکتا ہریش اسکی کلائی پکڑے ہوئے تھا۔رعنا نے ایک جھٹکے سے خود کو آزاد کروانا چاہا،لیکن گرفت اتنی ہلکی نہیں تھی۔وہ چیخنا چاہتی تھی،لیکن چیخ نہ سکی۔البتہ اپنی کلائی آزاد کروانے کی جدوجہد وہ اب بھی کر رہی تھی۔

”مجھے نہیں پتہ تھا تم اتنی جلدی مان جاؤ گی۔میں نے ملنے کا پیغام بھیجا اور تم چلی آئیں۔تم بہت خوبصورت ہو رعنا۔“

” میرا۔۔ہاتھ چھوڑو میرا۔میرا ہاتھ چھوڑو۔“ وہ ایک ہاتھ سے اسے دھکا دے رہی تھی۔اور اپنی کلائی آزاد کروا رہی تھی۔لیکن گرفت ہر لمحے سخت ہوتی جا رہی تھی۔گل رعنا کو موت اپنے قریب محسوس ہوئی۔

”کوئی غلط ارادہ نہیں ہے میرا میں شادی کروں گا تم سے۔۔۔تم اتنی اکڑ کیوں کر رہی ہو۔“ وہ اب اسکی مسلسل جدوجہد سے بے زار ہوا۔اور اب کے اسکے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنے سامنے کیا۔رعنا کو آج خود سے انتہا کی نفرت محسوس ہوئی۔

"مجھ سے ضد مت کرو ورنہ بہت برا ہو گا۔ سیدھا سیدھا پیغام بھیج رہا ہوں۔ قبول کرو ورنہ اور راستے بھی بہت ہیں۔" وہ اسکے دونوں بازو اپنی آہنی گرفت میں لئے کھڑا، حد درجہ سختی سے کہہ رہا تھا۔ "پتہ نہیں کس بات کے نخرے ہیں۔ اگر اتنی ہی سنسکاری تھیں تو میرے پیغام پہ آئیں کیوں؟"

رعنا مزید جدوجہد کرتی، ہریش کچھ اور کہتا اس سے پہلے ہی دائیں جانب سے ہریش کے گال پہ ایک زوردار چانٹا لگا تھا۔ اس کی گرفت رعنا کے ہاتھوں پہ بے اختیار ڈھیلی پڑی۔ یہی موقع تھا جب رعنا نے خود کو آزاد کروایا۔ کامل ہشام آنکھوں میں خون لئے سامنے کھڑا تھا۔ بلکہ کھڑا کیا تھا۔ اب تو وہ اس پہ جھپٹ پڑا تھا۔ مسلسل لاتوں اور مکوں سے وہ اسے مارے گیا۔ ایک ہفتہ پہلے وہ اپنی پھوپھی زاد کے لئے غیرت میں آیا تھا، لیکن آج معملہ مختلف تھا۔ ہریش کے ہاتھ میں رعنا کا ہاتھ تھا، اور کامل کو یوں لگا تھا جیسے کسی نے اس کے جسم پہ انگارے لوٹا دیئے ہوں۔ وہ کسی خبطی جنونی کی طرح اسے پیٹ رہا تھا۔

"ہمارے گھر میں گھس کر۔۔۔۔ ہماری عورتوں سے بد تمیزی کرو گے۔ اور ہم چھوڑ دیں گے؟ کیا بے غیرت سمجھ رکھا ہے۔" وہ دھڑادھڑ اسکے سینے پہ لاتیں مارے جاتا تھا۔ ہریش درد سے دوہرا ہونے لگا۔ لیکن کامل نے بس نہ کی۔ گل رعنا پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"تمہاری عورتیں ہمارے پیغام پہ آیا کریں گی تو یہی ہو گا ناں۔ اس سے پوچھو پچھلے ہفتے میں نے اسے یہاں بلایا تھا کہ نہیں۔۔۔۔ اتنے غیرت والے ہو تو اپنی عورتیں سنبھال کر رکھو۔"

اس نے بس ایک بات کہی تھی۔ اور کامل اسے مارنا چھوڑ چکا تھا۔ یہ مار اسکے اپنے دل پہ لگی تھی۔ ہریش اٹھا، درد سہتے، کراہ روکتے، گل رعنا نے دیکھا کہ آج کامل اس کے سامنے نہیں کھڑا ہوا۔ آج وہ

اسے اندر نہیں بھیج رہا تھا۔آج کامل کی نظریں سب کچھ تھیں بس اپنی نہیں تھیں۔ہریش بکتے جھکتے وہاں سے جا رہا تھا۔جبکہ کامل ساکن تھا۔

"اندر جاؤ گل رعنا۔" کامل کی آواز اسکی اپنی نہیں لگتی تھی۔گل رعنا نے کوئی صفائی دینے کی کوشش کی لیکن کامل اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔

"اندر جاؤ گل رعنا۔" وہ ایک بار پھر اسی بے تاثر لہجے میں بولا۔رعنا اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔وہ بس نم،زخمی نگاہیں اٹھائے اسے دیکھتی رہی۔اب کہ کامل نے بھی نظر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔آج کوئی لالٹین،کوئی فانوس نہیں تھا۔آج اندھیرا تھا۔گھپ اندھیرا۔

"اندر جاؤ گل رعنا۔" اس نے دہرایا۔گل رعنا پوچھنا چاہتی تھی کامل ہشام کیا تمھیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔لیکن وہ پوچھ نہ سکی۔اس نے بس اپنے قدم موڑ لئے۔کئی بار کچھ راستے آپ کے قدم نہیں دل تھکا دیتے ہیں۔لیکن حویلی تک جانے والے اس راستے نے گل رعنا کے دل کو شل کر دیا تھا۔

حویلی کے عقبی حصے میں کھڑے کامل ہشام کے دل کا بھی کچھ یہی حال تھا۔

حویلی کی رونق آج سارے شہر کی رونقوں کو مات دیتی تھی۔آنگن میں بچھی دریوں پہ عورتیں،لڑکیاں اور بچے بیٹھے تھے۔گیت گائے جا رہے تھے،قہقہے اور رونقیں تھیں کہ ماند نہیں پڑتی تھیں۔اسی طرح نظر اٹھا کر دیکھو تو تخت پہ بیٹھی فریدہ بیگم کے سامنے سویتا تائی بیٹھی تھیں۔سرخ ساڑھی میں ملبوس،مانگ میں ڈھیر سارا سندور بھرے،ہاتھوں اور کانوں میں ڈھیر سارا پیلا سونا چڑھائے وہ فریدہ بیگم

سے کچھ کہہ رہی تھیں۔وہ ہریش کی ماں تھیں۔اور اسکا پیغام گل رعنا کے لئے لائی تھیں۔کامل ہشام جو غصے سے بھرا ہوا اندر کی جانب بڑھ رہا تھا۔سویتا کی آخری بات اسکے کانوں میں پڑی۔

"ہماری طرف سے کوئی پابندی نہیں ہوگی۔گل رعنا اپنے دھرم پہ رہے گی اور ہم اپنے دھرم پہ۔" الفاظ نہیں جلتا کوئلہ تھے کامل جھلس کر رہ گیا۔تن فن کرتا وہ اسی جانب آیا۔تخت پہ بیٹھی اپنی پر سکون ماں کو دیکھا،پھر ایک نظر گل رعنا کی شرم سے زمین میں گڑتی ماں کو دیکھا۔

"سویتا تائی،گل رعنا کی نسبت ہم طے کر چکے ہیں۔اور اگر اگلی بار اسکے نام کے ساتھ اپنے بیٹے کا نام جوڑنے کی کوشش کی،تو میں پوری کوشش کروں گا کہ آپ کی پتری کے ساتھ میرا نام جڑے۔" سویتا دھواں دھواں ہوتے چہرے کے ساتھ اسے دیکھ کر رہ گئیں۔چہرہ غصے اور جلال سے لال بھبھوکا پڑنے لگا تھا۔

"آپ سے بات کرنی ہے امی اندر چلیں۔" وہ ایک نیا حکم صادر کرتا آگے بڑھ گیا۔چند لمحے بعد وہ حویلی کے اندر تھا۔کمرے میں رکھے انگریزی طرز کی صوفہ نامی نشست پہ بیٹھی اسکی ماں اپنے سامنے بیٹھے کامل کو بے حد سنجیدگی سے دیکھ رہی تھیں۔کامل کی آنکھوں میں اب غصہ نہیں تھا۔وہ تحمل کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

"میں چاہتا ہوں گل رعنا یہاں سے واپس جائے تو اسکے ساتھ میرا نام ہو۔" اس نے آنکھیں اٹھا کے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"خوابوں پہ ہر ایک کا حق ہوتا ہے۔کسی انسان کو حق نہیں کہ کسی دوسرے کو خواب دیکھنے سے روکیں۔"

"وہ یہاں سے جاتے ہوئے کس کا نام ساتھ لے جانا چاہتی ہے یہ زیادہ ضروری ہے کامل۔مجھے نہیں لگتا وہ لڑکی تمہارے لائق ہے۔تمہارے خواب دیکھنے کا اختیار آدھے خاندان کی لڑکیوں کو ہے۔لیکن تعبیر کس کے حصے میں آئے گی،یہ میں طے کروں گی۔"

"آپ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ اسے میرے نام سے زیادہ کوئی اور نام عزیز ہو گا؟"وہ جراح پہ اتر آیا تھا۔

"حویلی کی بیٹھک میں کوئی مرد اسکا راستہ روکتا ہے۔صبح نیم اندھیرے،جب ہر کوئی سو رہا ہو اس وقت گل رعنا چھت پہ جانے کی کوشش کرتی ہے،اور حد تو یہاں آکر ختم ہوتی ہے کہ حویلی کے عقبی حصے میں کوئی اسکا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔"

"یہ سب ایک اتفاق اور حادثہ تھا۔گل ایسی لڑکی نہیں ہے۔"اسکا انداز فورا دفاعیہ ہوا۔

"کیا تم اس عورت کے کردار کی گواہی دو گے،جو تمہارے ساتھ بغیر کسی تعلق کے آدھی رات سے صبح تک کا وقت صرف کر سکتی ہے؟اگر تم ہو تو دس اور بھی ہو سکتے ہیں۔ اتفاق بس کہانیوں میں ہوتے ہیں۔اصل زندگی سوچی سمجھی سازشوں کا مجموعہ ہے۔"

"آپ کیا چاہتی ہیں اماں۔میں نے آپ سے زندگی میں کبھی کچھ نہیں مانگا،کیا صرف ایک چیز نہیں مانگ سکتا؟" وہ ان کے قدموں کے قریب آ بیٹھا۔

"تم نے وعدہ کیا تھا کامل، تم نے کہا تھا تم میری باتیں مانو گے، تم وعدہ خلافی نہیں کر سکتے۔" یہ ایک ماں کی آس نہیں تھی، یہ حکم، لجاحت، منت بھی نہیں تھی۔ دور بہت دور یہ ایک دھمکی تھی۔

("میں کامل سے بات کروں گی اسکی جرات نہیں کہ میرا حکم ٹال سکے۔ ")

"تم میرا حکم نہیں ٹال سکتے کامل۔ تم اس صورتحال میں نہیں ہو۔ تم وہ انسان ہو جس نے اپنے باپ کو اپنے ہاتھوں سے مار دیا۔" کامل کی رنگت سفید پڑنے لگی، وہ اکڑوں بیٹھا مرد دھپ سے زمین پہ گرا۔ "تم نے کامل، تم نے مجھ سے میرا شوہر چھینا، اپنے طیش کی وجہ سے۔ اگر وہ کسی اور عورت سے مل رہا تھا۔ اگر وہ مجھے دھوکہ دے رہا تھا تو یہ ہمارا معملہ تھا۔ تمھیں کیا حق تھا کہ تم مجھ سے میرا شوہر چھین لو۔"

وہ دھیرے دھیرے بے سانس ہوتا جا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اسکی آنکھوں کی چمک ماند پڑ رہی تھی۔ اسکا چہرہ یوں تھا جیسے کسی نے سفید چونا پھیر دیا ہو۔

"اس رات، کامل اس رات جب تم میرے شوہر کو مار کر آئے تھے۔ تب میں نے تمھیں بچایا تھا۔ میں نے لوگوں سے تمہارا درندگی بھرا چہرہ چھپایا۔ اس رات، کڑکتے جاڑے، برستی بارش میں تم نے مجھ سے ایک وعدہ کیا تھا۔ "

"میں کبھی بھی، آپ کا کوئی حکم نہیں ٹالوں گا۔ کامل ہشام کی زندگی پہ سب سے زیادہ حق آپ کا ہے ماں۔" وہ دھیرے سے بڑبڑایا۔ اسکی ماں کا چہرہ کسی ڈائن کے چہرے سے کم نہیں لگتا تھا۔

"تم میرے بیٹے ہو، میرے مجرم، میرے غلام۔ تمھیں کوئی حق نہیں کہ تم اپنے لئے کوئی فیصلہ لو۔ تم ساری زندگی میرا حکم مانو گے کامل ورنہ میں ساری دنیا کو بتا دوں گی تم کیا ہو۔ کون ہو، اور پھر تمھارا عظیم بننے کا خواب ٹوٹ جائے گا۔ کانگریسی تم پہ ہنسیں گے، مسلم لیگی تم پہ لعنت بھیجیں گے۔ میں تمھیں سزا سنا رہی ہوں کہ آج سے تم گل رعنا کے خواب دیکھو گے، تو انکی تعبیر کو ایک جرم سمجھو گے۔" وہ رکی اپنے بیٹے کے مردہ ہوتے چہرے کو دیکھا۔ پھر سفید ساڑھی والا بازو آگے بڑھا کر اپنے کھردرے ہاتھ سے اسکی ٹھوڑی کو پکڑ کر اونچا کیا۔

"ہر مرنے والے سے اسکی آخری خواہش پوچھی جاتی ہے۔ کامل ہشام بتاؤ تمہاری آخری خواہش کیا ہے؟" سرد سفاک سے لہجے میں اس سے کچھ مانگنے کو کہا گیا۔ کامل ہشام چند لمحے بے سانس رہا۔ پھر رفتہ رفتہ اسکی رنگت بحال ہوئی۔ حلق میں اٹکے الفاظ جب باہر نکلے تو کچھ یوں سنائی دیئے۔

"آپ کو تعلقات نہیں غلامی چاہیے، رشتے نہیں رسن دار میں بندھے لوگ چاہیے۔ میں آپ کا من چاہا غلام ہوں، اور میں ساری زندگی یونہی آپ کی غلامی کروں گا۔" وہ رکا سرخ زخمی آنکھیں اپنی ماں کے چہرے پہ گاڑ دیں۔ "گل رعنا کو ایک موقع دیں امی، وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ میرے لئے آپ کی غلامی قبول کر لے گی۔" فریدہ مسکرا کر پیچھے کو ہوئیں، آنکھیں محظوظ کن انداز میں گھمائیں۔

"پھر ایسا کرتے ہیں، گل رعنا کو آج بلا ہی لیتے ہیں۔" وہ فراخدلی سے بولیں۔ دور کہیں انکے اپنے جملے انکے کانوں میں بازگشت کر رہے تھے۔

"مسئلہ کامل کے خواب نہیں۔ مسئلہ گل رعنا کی حقیقت ہے۔ گل رعنا کا اگر کوئی دشمن ہے تو گل رعنا خود۔"

گل رعنا کو طلب کیا جا چکا تھا اور اب کے حویلی کے اس وسیع کمرے کا حال مختلف تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

حویلی کا وہ پر تعیش اور آرام دہ کمرہ جہاں دیواروں میں نصب فانوس جل رہے تھے۔مسہری پہ دو عورتیں بیٹھی تھیں۔تمکنت اور مغروریت سے گردن اٹھائے بیٹھی فریدہ ہشام اور گردن جھکا کر، آنسوؤں کو روکتی گل رعنا کی ماں۔بیٹیوں کے لئے ڈالے جانے والے رشتے ہر ماں کے چہرے پہ سکون لاتے ہیں۔لیکن رشتے اگر ہریش جیسے ہوں۔تو بے سکونی ساتھ لاتے ہیں۔گل رعنا چوکھٹ سے ذرا آگے کھڑی تھی۔اور کامل اس انگریزی نشست پہ بیٹھا تھا۔اسکی نظریں آج گل رعنا کو تک رہی تھیں۔ایک آس تھی،امید سی۔

چند ایک بڑی بوڑھی عورتیں بھی جمع تھیں۔جنہیں اس قصے کے بارے میں علم تھا۔

”گل رعنا۔مجھے یہاں آج تم سے کچھ سوال کرنے ہیں۔کچھ حکم دینے ہیں۔اگر تم نے سر جھکایا تو مجھے یقین ہے ایک دن تمہارا مرتبہ اونچا ہوگا،جیسے کہ آج میرا ہے۔“

”آپ جیسا رتبہ نہیں چاہیے مجھے۔آپ کا تخت بہت اونچا ہے اتنا کہ یہاں آپ کو دوسروں کے دل دیکھنے میں دقت ہوتی ہے۔اور اتنا کہ حق کی بات سمجھنے میں مسائل ہوتے ہیں۔“ وہ کہنا یہی چاہتی تھی لیکن کہہ نہ سکی۔خاموش رہی کامل کی نگاہیں اسے تنبیہہ کر رہی تھیں۔اس نے خاموشی اختیار کر لی۔

(وہ دونوں زینوں پہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے تھے۔کامل لالٹین کو ہاتھ میں لئے بیٹھا تھا۔ گل رعنا مسلسل بولے جا رہی تھی۔یکدم وہ رکی۔"آزادی کیا ہوتی ہے کامل۔"اس نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

کامل اب کے لالٹین کے شیشے پہ انگلی پھیر رہا تھا۔

"آزادی صرف ایک خطہ نہیں ہوتا۔آزادی انسان کی ہوتی ہے۔اسکی سوچ کی،اسکے اعمال کی،اپنے دین پہ پیروی کرنے کی،ایک خطہ جہاں وہ رہ رہا ہے۔وہاں وہ اپنے مذہب پہ چل سکے،وہاں اسے کوئی ہولی منانے سے منع نہ کرے،کوئی گائے زبح کرنے سے منع نہ کرے۔"

"یعنی ہمارے ملک میں ہندوؤں کو بھی آزادی ہوگی۔کیا آزادی سب کے لئے ہوتی ہے۔"

"ہاں گل آزادی سب کے لئے ہوتی ہے۔ہمارا دین امن کا دین ہے۔وہ کہتا ہے کہ غیر مذہبیوں کے عبادت گاہوں کی بھی یونہی حفاظت کرو،جیسے تم اپنی عبادت گاہوں کی کرتے ہو۔")

"تمہارا اس ہندو لڑکے سے کیا تعلق تھا؟یہاں تم یہ نہیں کہہ سکتیں کہ تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔دو مرتبہ دو جگہ تم دونوں کی مشترکہ موجودگی محض ایک اتفاق نہیں ہو سکتی۔اپنا جرم قبول کرو رعنا۔" وہ نخوت سے کہہ رہی تھیں۔وہاں جہاں آدھا خاندان جمع کیا ہوا تھا۔گل رعنا نے نظر موڑ کر کامل کو دیکھا۔وہ اپنی ماں کا غلام تھا۔اور اب اسے بہو بھی غلام چاہیے تھی۔

اس نے جمع ہوئی عورتوں کو دیکھا۔وہ رعنا کے راز کو دو گھڑی پیٹ میں نہ رکھ سکتیں۔بس چند دنوں کی زلالت اور پھر کامل کا ساتھ۔بس زرا سی غلامی اور پھر کامل کے ساتھ آزادی کا سفر۔

”میرا اس لڑکے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ہماری دو جگہوں پہ مشترکہ موجودگی ایک اتفاق تھی اور کچھ نہیں۔“ گل رعنا آزاد تھی سو اس نے آزادی چن لی۔کامل ہشام نے آنکھیں زور سے میچ لی تھیں۔تکلیف حد سے سوا ہونے لگی۔گل رعنا گردن کڑائے کھڑی تھی۔اس شخص سے آزادی کی کیا امید جو خود ایک غلام ہو۔

(زینوں پہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے وہ ہمیشہ کی طرح کسی کہانی کا حصہ معلوم ہوتے تھے۔لالٹین کی مدھم روشنی میں کامل کا چہرہ واضح دکھائی دے رہا تھا۔رعنا چند پل اسے دیکھتی رہی۔پھر سوال کیا۔

”آزاد اور عظیم انسان کیسا ہوتا ہے کامل؟“

اس نے لالٹین نیچے رکھا۔اپنا چائے کا کپ گل کی اور بڑھایا۔وہ جھینپ گئی۔یعنی جب وہ ندیدوں کی طرح اسکی چائے دیکھ رہی تھی،تب کامل اسے دیکھ رہا تھا؟

”آزاد انسان اپنے قول، فعل، عمل کا اظہار کرنے میں آزاد ہوتا ہے۔وہ کسی کی ناراضگی کے خوف سے،کسی محبت یا کسی طاقت کے چھن جانے کے خوف سے حق بات کہنا نہیں چھوڑتا۔آزاد انسان کی گردن صرف خدا کے سامنے جھکتی ہے۔وہ لوگوں کے سامنے ہمیشہ ڈٹ کر کھڑا ہوتا ہے کیونکہ اسے یقین ہوتا ہے کہ تمام فیصلے اللہ کے ہیں۔تمام عزتیں اللہ کی ہیں۔اور ذلت دینے والا بھی اللہ ہے۔انسان تو بس کٹھ پتلی ہیں۔")

"میں یہاں تمہاری قسمت کا فیصلہ کرنے بیٹھی ہوں گل رعنا۔کامل ہشام ایک اعلیٰ اور عظیم مرد ہے۔تمہیں بس اپنا گناہ ماننا ہے اور پھر میں تمھیں عزت دوں گی۔رتبہ اور مقام دوں گی۔میں تمہاری اور کامل کی شناسائی سے واقف ہوں کیا تمھیں اسے کھونے کا خوف نہیں ہے؟"اب کے ان کے لہجے میں استہزاء تھا۔گل رعنا مسکرائی۔

"عزت،ذلت مرتبہ مقام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔کامل اور میری شناسائی کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہے۔میں کبھی اس سے ملنے کسی چور دروازے سے نہیں گئی۔نہ میں نے اسے کبھی راز سمجھا ہے۔کھونے کا خوف ان کو ہوتا ہے جنہیں اپنے جذبات کی سچائی پہ اعتبار نہ ہو۔گل رعنا کے دل میں کھوٹ نہیں اور جذبات میں جھوٹ نہیں۔میں ہر قسم کے خوف سے آزاد ہوں۔"

کامل یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔یہ کون تھی؟یہ حوصلہ یہ جذبہ یہ دلیری۔آج اسکا دل چاہا تھا وہ واقعی گل رعنا سے بھیک میں دلیری لے لے۔

("آپ نے بتایا نہیں عظیم انسان کون ہوتا ہے؟"

"جو آزاد ہو وہ عظیم ہی ہوتا ہے۔اس سے بڑی عظمت کیا ہوگی کہ ایک انسان مجمعے میں کھڑے ہو کر حق کہنا جانتا ہو۔"

"آزاد کیسے بنا جاتا ہے۔؟"اس نے ہتھیلی تلے ٹھوڑی ٹکا کر سوال کیا۔

"اللہ پہ توکل کر کے۔اسے واقعی رب جان کر۔اسے عزت، ذلت کا مالک جان کر۔کہنا آسان ہوتا ہے گل۔لیکن اپنے تمام فیصلے اللہ کے حوالے کر،سچائی اور حق پہ ڈٹ جانا بڑی بات ہوتی ہے۔آزاد انسان وہ بن سکتا ہے جس کے دل سے نمود و نمائش کا شوق نکل جائے۔بس اللہ اور بندہ۔")

فریدہ بیگم سپاٹ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔کامل کی گردن جھکی ہوئی تھی۔

"اگر تم گناہگار نہیں بھی ہو،تو تمھیں مجھ سے معافی مانگنی ہوگی۔میرے نزدیک تم گنہگار ہو۔میں تمہاری اس لڑکے کے ساتھ موجودگی کو اتفاق نہیں مانتی۔بس ایک معافی اور زندگی تم پہ مہربان ہو جائے گی۔" کامل نے گردن اٹھا کر ملتجی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔جیسے کہنا چاہتا ہو،عظیم اور آزاد بننے کے لئے دنیا پڑی ہے۔اس وقت شکست قبول کر لو،ایک ایسی شکست جس میں تمھیں من چاہا انعام مل جائے گا۔

"میں معافی نہیں مانگوں کی کیونکہ آپ رتبے دینے والی کوئی نہیں ہیں۔آپ خود میرے اللہ کی محتاج ہیں۔اور کامل ہشام کوئی انعام نہیں۔انعام میں ہوں اسے مجھے جیتنا آنا چاہیے۔"اور یہاں اس کی اس بات نے گل رعنا کے اپنے تابوت میں کیل ٹھونک دیئے تھے۔کامل کی آنکھیں زخمی ہوئیں۔دل سن ہوا اور پھر سارے جذبات شل ہو گئے۔

رفتہ رفتہ سب نکلتے چلے گئے۔کمرے میں کوئی بچا تو وہ کامل ہشام اور گل رعنا تھے۔وہ آگے بڑھی۔دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے کامل ہشام کو کہنی سے پکڑ کر اسکا رخ اپنی جانب کیا۔

"میں آزاد ہوں،میں غلامی نہیں چن سکی۔میں تمھارے ساتھ ملکہ بن کر رہ سکتی ہوں۔کنیز نہیں۔"

کامل ہشام نے آہستگی سے اپنی کہنی آزاد کروائی۔

”تخت مبارک ہو۔مگر یاد رکھنا یہ سکون چھین لیتا ہے۔لوگ دشمن کروا دیتا ہے اور۔۔۔"وہ رکا۔۔

”اور کیا ؟“رعنا سننا چاہتی تھی۔کامل چند لمحہ اسے دیکھتا رہا۔

”تخت دامن کو محبت سے خالی کر دیتا ہے۔تم آج خالی دامن ہو گئیں مبارک ہو۔“وہ صور سا پھونکتا باہر نکل گیا۔گل رعنا اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔اس کا دل ٹوٹا تھا۔اور اسکی گونج وہ اگلے کئی سال سننے والی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆

ہندوستان کا ہر گلی کوچہ ان دنوں قربانیاں دے رہا تھا۔لوگ کوچ کیے جا رہے تھے۔اپنی جائیدادیں چھوڑ،اپنوں کو الوداع کہتے لوگ نئے وطن کی راہ لے رہے تھے۔مسلم لیگ ان دنوں اپنے کام مستعدی سے انجام دیتی نظر آ رہی تھی۔لوگ پر جوش تھے اور غم زدہ بھی۔ہر محلہ اپنے اجڑ جانے کو رو رہا تھا،ہر محلہ اپنے ساکنان کی پامالی پہ غم زدہ تھا۔یونہی چلتے پھرتے ایک پھپھے کٹنی کی آنکھوں دیکھا حال،ایک سائل کی بے اختیار نظر،اور ایک راہ گزر کی آنکھوں دیکھا حال پیش خدمت ہے۔پھپھے کٹنی بتاتی ہے۔

سفید مسجد کے ساتھ والے محلے میں سرمد صاحب کی تین جوان بیٹیاں غیر شادی شدہ تھیں۔بڑی والی کے سسرالی تین مرتبہ تاریخ لینے آ چکے تھے لیکن نہ کھانا کھلانے کو روپے تھے نہ جہیز میں لے جانے کو چار جوڑے۔گھر بیٹھی بیوی نے روپے جوڑ جوڑ کر جہیز بنایا۔بیٹی کے سسرال والی آئے،تاریخ طے

ہوئی مٹھائیاں بانٹی گئیں۔پھر ایک دن دور دراز علاقوں سے لٹے پٹے مسلمانوں نے دہلی میں قدم رکھا۔مسلمان انہیں اپنے گھر پناہ دے رہے تھے۔بھلا وہ لوگ کیا پناہ دیں جن کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔سرمد صاحب صحن میں رکھی لوہے کی کرسی پہ افسردہ بیٹھے تھے۔یوں اپنے مسلمان بھائیوں سے منہ موڑ لینا ان کا دل زخمی کر رہا تھا۔اسی پل برآمدے میں لگے پردے میں سرسراہٹ ہوئی۔زبیدہ بیگم ہاتھ میں روپے اور بیٹی کے جہیز کے برتن لئے آ رہی تھیں۔

”لے جائیں یہ سارے روپے،اور بیچ دیں یہ برتن۔ہزاروں بیٹیاں جب بھوکی مر رہی ہوں ہم اپنی بیٹی کی تھالی کیسے بھر دیں؟“

سرمد صاحب نے گردن اٹھا کر انھیں دیکھا۔”اپنی بیٹی کا سوچو بیگم رشتہ ٹوٹ بھی سکتا ہے۔مسلم لیگی کی بیوی نہ بنو۔بیٹی کی ماں بنو۔“

”میں تو ماں ہی بننا چاہتی تھی۔لیکن بیٹی رہنما کی ہے،رہنمائی کا شوق اس کو جاگا ہے۔اور میں ماں ہونے کے ساتھ ایک رہنما کی بیوی بھی ہوں۔مائیں بیٹیوں کا سوچتی ہیں۔رہنما قوموں کا سوچتے ہیں۔“سفید مسجد کے برابر والے محلے میں قربانی کی ایک لازوال داستان لکھی جا چکی تھی۔

راہ گزر کہتا ہے کہ۔۔۔

ہری جھنڈیوں والی ایک گلی سے گزرتے ہوئے ایک چھوٹے سے گھر سے چند آوازیں بلند ہوئیں۔بوڑھی ضعیف آوازوں میں تاسف تھا اور دکھ بھی۔تجسس کے مارے راہ گزر نے دروازے سے لگ کر باتیں سننی چاہیں۔

صحن میں رکھے تخت پہ ایک بوڑھی عورت لیٹی تھی۔اس کا جوان خوبرو بیٹا اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ان دونوں کی حالت سے یوں لگتا تھا جیسے کسی اونچے گھر سے تعلق رکھتے ہوں۔اور یہ حقیقت بھی تھی۔رخسانہ بی کا تعلق ایک معقول گھرانے سے تھا۔شوہر کی وفات کے بعد اپنے بھائیوں کے گھر آئیں تو نہ روپے کی کمی ہوئی نہ عزت کی۔چند دن قبل ہی انکا بیٹا اپنے ماموں کی دامادی کا شرف حاصل کر چکا تھا۔بیٹی کی نسبت طے کر کے ماموں نے اسے علی گڑھ کالج بھیجا۔لیکن دنگے اور فسادوں کی ماری ایک ماں نے جب مرتے ہوئے اپنی بیٹی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیا تو جمال انکار نہ کر سکا۔

جب پڑھائی کے لئے دی گئی ساری رقم اسے پاکستان جانے والے قافلوں پہ خرچ کرنی پڑی تو اسے کوئی غم نہ ہوا۔یہاں تک کہ اپنا حصہ اونے پونے بیچ کر کئی افراد کو پاکستان کی ٹکٹ کروا دی۔کئی بھوکوں کو کھانا دیا اور کئی بہنوں کے سروں پہ دوپٹہ ڈالا۔افسوس اور رنج اسے تب بھی نہ ہوا۔ایثار کے یہ جذبے جب ماموں کے گھر تک پہنچے تو اسے اور اسکی ماں کو گھر سے نکال دیا گیا۔وہ اپنی ماں اور بیگم کو لے کر چلا آیا اف تک نہ کی۔

”کیا پچھتانے لگے ہو جمال احمد؟“ ماں کی آواز میں تاسف تھا۔

”ہرگز نہیں بلکہ خوش ہوں کہ میرا ضمیر مطمئن ہے۔اگلے ستر سال بعد جب کوئی تقسیم ہند کی کہانی لکھے گا تو جمال کے ایثار کو بھی یاد کرے گا۔جب روز محشر نیکوکاروں کو اٹھایا جائے گا تو شاید جمال بھی ان میں شامل ہو۔خدا مجھے ان لوگوں میں شامل کرے۔“وہ کہتے ہوئے رکا۔”کیا آپ پچھتا رہی ہیں اماں؟“

"ہاں پچھتاوا ہے کہ کاش میرے پاس بھی ویسی کوٹھی اور ویسی رقم ہوتی جیسی میرے بھائیوں کے پاس ہے۔ پھر میں بھی اسے قافلے پہ خرچ کرتی۔ پھر میں بھی ایثار والوں میں شمار ہوتی۔ نہ کہ میرے بھائیوں کی طرح تنگ دلوں میں۔" راہ گزر کی آنکھیں نم ہوئیں۔ یہ کیسے لوگ تھے جس جذبے نے اپنے ہی خاندان دور کروا دیے ان جذبوں میں سچے اور کھرے۔ خدا ان کو ان کے ایثار کا صلہ دے۔

سائل کہتا ہے کہ صدائیں لگاتے ہوئے وہ ایک محل نما حویلی کے سامنے کھڑا تھا۔ حویلی پہ تالے پڑ رہے تھے۔ نذیر احمد شاہ اپنی چار بیٹیوں اور دو بیٹوں کے ساتھ اس تالے کو لگتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ ساتھ ایک سکھ کھڑا تھا۔ جو اونے پونے حویلی کو خرید لینے پہ پھولے نہ سما رہا تھا۔ ساتھ ساتھ شاہ صاحب کا ڈرائیور "چندر" کھڑا تھا۔ اپنے مالکین کی بے بسی اس سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ انہیں کسی اور زمین جاتے دیکھ اس کا دل پھٹ رہا تھا۔

"مالک یہ حویلی۔ یہ شان و شوکت۔ یہ ٹھاٹھ پاکستان آپ کو نہیں دے سکے گا۔ وہ نئ زمین ہے، نئ زمین پہ تو پودا بھی اگ جانے میں سالوں لگا دیتا ہے۔ آپ کس امید پہ یہ سب چھوڑے جا رہے ہیں۔" شاہ صاحب مسکرائے۔

اس مسکراہٹ میں کرب تھا۔ اپنا گھر چاہے جہنم میں ہو چھوڑتے ہوئے دل پھٹ پڑتا ہے۔

"ہم عام لوگ نہیں ہیں چندر ہمارے سر پہ ذمہ داریاں ہیں۔ ہمارے پیچھے لوگ ہیں۔ کئ لوگ ہمیں دیکھتے ہیں اور پھر مستقبل کا لائحہ عمل تیار کرتے ہیں۔ مرشد کا کہنا کون نہیں مانتا۔" وہ حویلی کو دیکھتے ہوئے آزردگی سے کہہ رہے تھے۔" اگر یہ اونچی حویلی ہم نہیں چھوڑیں گے، تو ہمارے مرید اپنی جھونپڑی نہ چھوڑیں گے۔ یہ ٹھاٹھ باٹھ اگر پاکستان نہ بھی دے سکا تو کوئی بات نہیں۔ وہ ہمیں روح کی

آزادی دے گا۔اللہ کی نظر میں ہمیں معتبر کرے گا۔اس وقت سوال ہمارا نہیں ہے قوم کا ہے۔جو ہم بوئیں گے وہی آنے والی نسل کاٹے گی۔"وہ اپنی اولاد کی طرف مڑے۔

"تم لوگوں کو حق ہے کہ آج میرے ساتھ آؤ یا پھر نہ آؤ۔اپنے لیے ٹھاٹھ چن لو یا پھر میرے ساتھ جراءت کے سفر پہ چلو۔میں روزِ قیامت تم سے کوئی حساب نہ لوں گا۔"

مجال ہے جو کوئی ایک بھی رکا ہو۔کسی ایک کے دل میں بھی کھوٹ آیا ہو۔وہ ایسی راہ کے مسافر تھے جہاں سر کٹ جانے تھے۔لیکن پرواہ نہیں تھی۔جس دن کسی قوم نے تقسیم ہند کے دوران مسلمانوں کے حوصلے جیسے حوصلے جتائے،ایسا ایثار ایسی قربانیاں دیں۔اس دن تاریخ بدلے گی۔خدا کرے یہ تاریخ بھی مسلمان ہی بدل سکیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تقریب میں کیا ہوا،کون آیا کون گیا۔رعنا کو کچھ خبر نہ ہو سکی تھی۔وہ ساری رات روتی رہی تھی۔اماں کو کہہ دیا طبیعت ٹھیک نہیں لیکن کامل کی آنکھوں میں وہ بے رخی سی دیکھ اسکا کلیجہ کٹ گیا تھا۔ فرشی بستر پہ پڑے پڑے وہ کئ لمحے یونہی ساکن رہی۔آنکھیں سوجھ چکی تھیں۔بدن درد سے چور تھا۔ اذان کی آواز بلند ہوئی تو رعنا دھیرے سے اٹھ بیٹھی۔کمرے میں جلتا واحد لالٹین لئے آج وہ وضو کرنے نماز پڑھنے نہیں جا رہی تھی۔اسکے قدم سیڑھیوں کی جانب بڑھ رہے تھے۔ایک ہفتہ،بس ایک ہفتے میں کامل اسکے دل کو یوں چھو چکا تھا کہ اب کسی کا خیال بھی دل کی زمین کو میلا کر رہا تھا۔محبت کی پہلی دستک لڑکیوں کے دل پہ آندھی کی طرح اترتی ہے۔جو دل کے تمام دروازے اکھاڑ پھینکتی ہے۔اور تم نے آندھیوں سے اکھڑے دروازے بڑی مشکل سے جڑتے دیکھے ہوں گے۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم لیتی زینوں کی اور چلی آئی۔اور اپنی مخصوص جگہ پہ آ کر بیٹھی۔لال ٹین کو وہیں رکھا، جہاں اسکی جگہ تھی۔ دیوار سے ٹیک لگا کر اس نے آنکھیں اس جانب کر دیں جہاں سے کامل روز آتا تھا۔کئی لمحے بیتے، کئی ساعتیں گزریں، کوئی آہٹ نہ ہوئی۔کوئی قدم اسکی جانب نہ مڑے۔ رعنا نے آنکھیں موند لیں۔آنکھوں سے گرم گرم سیال بہنے لگا۔اسکے دل کو کچھ ہوا تھا۔بے اختیار جیسے کسی نے تھپڑ دے مارا ہو، یا پھر شاید کسی نے مٹھی میں لے کر دبادیا ہو۔

قدموں کی ہلکی سی چاپ اسے محسوس ہوئی۔رعنا نے پٹ سے آنکھیں کھول لیں۔کامل ہشام زینوں سے اتر رہا تھا۔اسکی آنکھیں بھی شب خوابی کا شکار لگتی تھیں۔سیاہ رنگ کے کرتے، پاجامے میں ملبوس تھکی تھکی آنکھوں والا شخص اپنی مخصوص جگہ پر آ کر بیٹھا۔جس پر رعنا کے پیر تھے، اسی جانب کامل دیوار سے سر ٹکا کر بیٹھ گیا۔وہ دونوں مخالف سمت میں تھے۔ایک دوسرے کے چہرے اب با آسانی دیکھ سکتے تھے۔رعنا ہمیشہ آنکھیں اسکے چہرے پہ مرکوز کئے بولتی رہتی تھی۔اور کامل کبھی لالٹین کو دیکھتا، کبھی دیوار کو، اس نے کبھی رعنا کے چہرے پہ نظر نہیں جمائی تھی۔۔آج اس نے گل رعنا کا چہرہ دیکھا تھا۔سرخ آنکھیں، گیلا چہرہ، بکھرا حلیہ۔وہ بے تاثر نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔کئی لمحے بعد جب وہ بولا تو اسکی آواز پست تھی۔

”میں پنڈتوں کے محلے میں پیدا ہوا تھا گل۔میرا باپ ایک بنیے کا شریک دار تھا۔ہشام حسین، اور لالہ چندر کانت شراکت دار تھے۔وہ برہمن تھے۔اور ہم مسلمان۔“ کامل اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا، اور گل رعنا اسے دیکھ رہی تھی۔آج کامل پہلی بار اپنے غم سنا رہا تھا، اپنا تاریک حصہ اسکے سامنے کھول رہا تھا۔

"میں نے جب آنکھ کھولی تو خود کو نارنجی لباس والے پنڈتوں کے درمیان دیکھا۔یہ ایسا محلہ تھا جہاں اذان کی آواز بھی نہ آتی تھی۔یہاں پوجا پاٹ کی آواز آتی تھی۔ہر مسلمان بچہ،اپنے بچپن میں جوش سے آیات دہراتا ہے،میں منتر دہراتا تھا۔کیونکہ میں نے وہی سنے تھے۔"اسکی آنکھیں کرب زدہ سی تھیں۔رعنا کو آج یہ شخص غیر لگا۔

"اماں نماز پڑھتی تھیں۔قرآن پڑھتی اور مجھے بھی پڑھا دیتی تھیں۔لیکن مجھے آیات کہاں سے یاد رہتیں جب میرے آس پاس مندر کے گھنٹے،تلسی کی پوجا،اور نہ جانے کون کون سے منتر گونجتے تھے۔اسکول جانے لگا تو مجھ پہ آوازیں کسی جاتی تھیں۔برہمن مجھے مسلہ اور مسلمان مجھے نیم برہمن کہتے تھے۔میری پہچان،میرا عقیدہ،سب مسخ ہو گیا تھا۔میں نمازیں پڑھتا تو منتر یاد آتے تھے۔ابا اس محلے کو چھوڑنے پہ راضی نہیں تھے،کیونکہ انہیں لگتا تھا ماحول اثر انداز نہیں ہوتا۔اگر انسان کے دل میں کھوٹ نہ ہو۔میں کامل ہشام میرا عقیدہ مسخ شدہ،اور میری پہچان گمشدہ تھی۔آیات پڑھنے والوں کے گھر پیدا ہو کر بھی،میں مندر کے گھنٹے بجاتا،تلسی کی پوجا کرتا،اور منتر پڑھتا تھا۔کوئی مجھ سے آیات الکرسی پڑھنے کو کہتا،تو میری زبان پہ ہنومان چالیسا ہوتی۔لیکن یہ میرا قصور نہیں تھا،خیر میں اسی طرح پلا بڑھا ابا کے پاس ڈھیر سارا پیسہ تھا۔انہوں نے مجھے انگلینڈ بھیج دیا۔یہاں آ کر میں آئے دن سنتا تھا کہ آج آزادی کے لئے فلاں تحریک چلی،آج پاکستان بننے کی امید اتنی مضبوط ہوئی۔مجھے کوفت ہوتی تھی رعنا۔"اس نے گردن جھکا لی،آنسو ٹپ ٹپ اسکی آنکھوں سے گرنے لگے۔گل رعنا نے کبھی اسے یوں ہارتے نہیں دیکھا تھا۔وہ بولتے بولتے تھک گیا تھا۔گلا نہیں دل تھک رہا تھا۔

"میں بہت تنگ پڑتا تھا۔جب ان آزادی کی تحریکوں کے بارے میں سنتا تھا۔میں ہمیشہ اپنے دوستوں سے کہتا تھا۔کہ یہ فضول کی رٹ ہے،یہ خوامخواہ کی ضد ہے۔بھلا آزادی کیا دے گی؟ارے ہم نے ان لوگوں کے ساتھ صدیاں گزار دی ہیں،اب کیا آگے نہیں رہ سکتے۔یہ بس متنفر فرقے کی چال ہے اور کچھ نہیں۔پھر ایک دن۔۔"وہ لمحے بھر کو خاموش ہوا۔

"ایک دن میرا ایک دوست میرے پاس آیا۔اس نے نے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھا،میرے قریب بیٹھا۔پھر کہنے لگا۔آؤ کامل ہشام آج تمھیں ایک کہانی سناتا ہوں۔

برسوں پہلے کی بات ہے۔ایک بادشاہ کے یہاں سات بیٹیاں تھیں۔اسے نرینہ اولاد کی بڑی خواہش تھی۔لیکن چار بیگمات کے باوجود اسکے یہاں اولاد نرینہ نہیں تھی۔ایک دن بادشاہ کے یہاں بیٹا ہوا،بادشاہ بہت خوش ہوا۔اس نے خیر خیرات کی،لوگوں میں انعامات تقسیم کروائے،اور بہت خوشیاں منائیں۔بادشاہ کا بیٹا اپنی سات بہنوں کے ساتھ رہنے لگا۔انکے ساتھ رہتا،کھاتا پیتا،اٹھتا بیٹھتا،یونہی کئی سال گزرے شہزادہ اٹھارہ سال کا ہو گیا۔انہی دنوں بادشاہ کے محل پہ حملہ ہوا۔کچھ باغی تھے،جنہوں نے ریاست کے ساتھ غداری کی تھی۔بادشاہ اور اسکی بیگمات کو مار ڈالا گیا۔ اور باغی اب کے سارے محل پہ حملہ آور ہوئے۔۔بادشاہ کی سات بیٹیاں،ملازمائیں چیخ چیخ کر کہتی تھیں۔خدا کے لئے کسی مرد کو بلاؤ،خدا کے لئے کسی مرد کو بلاؤ۔

ان تمام آوازوں کے درمیان ایک مردانہ آواز بھی تھی۔بادشاہ کا اٹھارہ سالہ بیٹا رو رو کر پکار رہا تھا۔خدا کے لئے کسی مرد کو بلاؤ۔"

گل رعنا کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی سی ہوتی محسوس ہوئی۔وہ تھم سی گئی۔آس پاس گزرتی ہوا بھی ساکن ہو گئی تھی۔کامل کہتا رہا۔

”یہ وہ وقت تھا رعنا جب میرے منہ پہ چابک لگا تھا۔مجھے صاف صاف بتا دیا گیا کہ صحبت کا اثر کیا ہوتا ہے۔مجھے بتایا گیا کہ اس قوم کے ساتھ ہمارا کوئی مستقبل نہیں،یہ نیند سے جاگنے والا لمحہ تھا۔اور میں جاگ گیا۔۔میں نے پڑھائی مکمل کی،ہندوستان واپس آیا اور مسلم لیگ میں شامل ہو گیا۔لیکن مجھے قبول نہیں کیا گیا۔مجھے کامل ہشام کو مسلمانوں نے بھی قبول نہیں کیا۔“

”مسلم لیگی ایسے نہیں ہوتے۔“رعنا کو بہت کچھ برا لگا تھا۔کامل زخمی سا مسکرایا۔اور چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

”مسلم لیگ انسانوں کی جماعت ہے فرشتوں کی نہیں۔اور انسان اپنے ساتھ ہوئے ظلم نہیں بھولتے۔مسلم لیگ کے چند لیڈر اگر مجھے قبول نہیں کرتے تو یہ انکا حق ہے۔ان لوگوں نے اتنے دھوکے کھائے ہیں کہ اب اپنے بازو پہ سانپ کا گمان ہوتا ہے۔ہم نے اس ملک کو اپنا سمجھا،لوگوں کو اپنا سمجھا۔لیکن ہمارے ساتھ دھوکا ہوا۔ہر مسلم لیگی ڈسا ہوا ہے۔دھوکے کا،دغا کا،بے ایمانی کا،دنگوں میں ہم نے ان لوگوں کو اپنے اوپر تلوار اٹھاتے دیکھا جو کہتے تھے ہندو مسلم بھائی بھائی۔“ وہ تلخی سے ہنسا۔”کچھ دن قبل جو دنگے ہوئے تھے ان میں ہندوؤں نے مسلمانوں کو جانوروں کی طرح مارا،گھر لوٹے،عورتوں کے ساتھ برا کیا۔میں انہی ہندوؤں کے محلے سے اٹھ کر آیا ہوں اب بتاؤ گل کون کرے گا میرا اعتبار؟“

"میں کروں گی آپ کا اعتبار۔۔۔ہمیشہ،ساری زندگی۔"کامل ایک بار پھر سر جھکا کر ہنس پڑا۔تم اسے ہنستے ہوئے دیکھو تو رو پڑو۔

"تم کونسا ساری زندگی میرے ساتھ رہنے والی ہو۔تم تو کل صبح لاہور جا رہی ہو گل رعنا۔"کوئی برچھی تھی،جو تیزی سے رعنا کے دل میں گھسا دی گئی تھی۔وہ پلک جھپکے بغیر کامل کو دیکھے گئی۔

"تم جا رہی ہو ناں؟تمھیں جانا چاہیے یہاں رہ کر کیا کر لو گی۔"وہ عام سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔لیکن کیا یہ بات اتنی عام تھی؟دل سے خون رسنا کیا ہوتا ہے آج رعنا کو علم ہوا تھا۔

"میں رک سکتی ہوں کامل اگر کوئی مجھے روکنا چاہے۔"

"پاگل مت بنو رعنا۔وہ ہریش،وہ ایک آوارہ لڑکا ہے،اوپر سے غیر مذہبی۔خود کو اس کے لئے ضائع مت کرو۔واپس جاؤ۔"کوئی پتھروں کا تھال تھا،جو گل رعنا کے سر پہ لڑھکا دیا گیا تھا۔

"آپ کو لگتا ہے میں ہریش کے لئے رکنا چاہتی ہوں؟"اسکے حلق سے پھنسی ہوئی آواز نکلی۔کامل کی آنکھوں میں انجانا سا تاثر تھا۔

"اور بھلا کس لئے رک سکتی ہو؟اور ہے ہی کون۔کیا کوئی ہے رعنا۔"کامل اسے بتا رہا تھا کہ کل رات کے واقعے کے بعد وہ اسکے لئے نہیں ہے۔وہ اتنی آسانی سے کیسے کہہ سکتا تھا۔رعنا کو سانس لینے میں دشواری ہونے لگی۔اسکی آنکھیں پھیل گئیں۔صدمے سے ،بے یقینی سے۔

"آج تمہارا یہاں آخری دن ہے آؤ تمھیں شہر کی سیر کروا لاؤں۔"کامل اپنی جگہ سے اٹھا،ہتھیلی رعنا کے آگے پھیلائی۔وہ بس اسے دیکھتی رہی،رعنا کو سمجھ نہیں آیا کہ کامل اسکے دل کے اندر گھسی

برچھی کو نکال رہا تھا؟یا پھر مزید تیزی سے اندر گھسا رہا تھا۔کئی لمحے جب اس نے ہاتھ نہ بڑھایا،تو کامل نے جھک کر خود ہی اسکا ہاتھ پکڑا،اور اسے کھڑا کیا۔

"آج تمہارا اس شہر میں آخری دن ہے۔آؤ تمھیں سیر کروا لاؤں۔کل تم واپس لاہور جاؤ گی۔تمھیں جانا چاہیے آخر یہاں رکھاہی کیا ہے؟"

تم۔۔آوازیں مدھم ہوتے ہوتے معدوم ہوتی چلی گئیں۔اب سارا امرتسر چپ کی چادر اوڑھ گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

جولائی کا آسمان آج آگ برسا رہا تھا۔امرتسر کے ایک چھوٹے سے پارک میں اس وقت لوگوں کا رش نہ ہونے کے برابر تھا۔یہ بٹوارے کا وقت تھا۔کسی کو سیر کرنے،اور کروانے کی فرصت نہیں تھی۔ درخت کی چھاؤں تلے رکھی ایک سنگی بینچ پہ گل رعنا بیٹھی تھی۔کامل اسکے پیروں کے قریب گھاس پہ بیٹھا تھا۔وہ کسی غیر مرئی نقطے کو تک رہا تھا۔رعنا کے دل و دماغ میں آگ مچی تھی۔روح زخمی ہو گئی تھی لیکن بس لب سیئے وہ یونہی بیٹھی تھی۔کئی لمحے یونہی بیٹھے رہنے کے بعد اس نے بلاآخر کامل کو مخاطب کر لیا۔

"آپ نے مسلم لیگ میں شمولیت کیوں اختیار کی تھی کامل۔"اسکی آواز ہلکی اور پست تھی۔

"میں اپنے نام کے ساتھ جڑا برہمن کا ٹھپہ ہٹانا چاہتا تھا۔میں دنیا کو بتانا چاہتا تھا کہ میں کامل ہشام زندگی کے تیس سال بنارس کے پنڈتوں کے ساتھ گزارنے کے بعد بھی کتنا عظیم ہوں۔میں واقعی عظیم ہوں۔"

”جن نیک کاموں کو نمائش کے لئے کیا جائے،اللہ ان پہ ثابت قدمی نہیں دیتا۔اللہ ان کے ذریعے سکون اور عزت نہیں دیتا۔نمائش آپ کے عمل کو دو کوڑی کا کر دیتی ہے کامل۔“وہ یہی کہنا چاہتی تھی۔لیکن کچھ لوگوں کو نصیحت کرتے وقت آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ حد پار کر آئے ہیں۔ اب انکا ہاتھ پکڑ کر روک لینا،ان کو آواز دے دینا اس سب کا فائدہ نہیں ہوتا۔

”آزادی کیسے ملتی ہے کامل ہشام۔“اب کے سوال بدلا۔

”محنت سے،ہمت سے،یکجہتی اور ایمان سے۔لگن سے “اس نے گنوایا پھر رکا۔”تم بتاؤ گل آزادی کیسے ملتی ہے؟"

”قربانی سے،ایثار سے،بغیر کسی مفاد پرستی کے،بغیر کسی نمود و نمائش کے جذبے سے۔آزادی ایسے ملتی ہے۔“کامل نے ٹیک لگا لی۔بازو سینے پہ باندھ لئے۔اب وہ ترچھا ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔

”جانتی ہو گل میں خود کو دنیا کا سب سے عظیم انسان سمجھوں گا جب ملک آزاد ہو گا۔جب ہم بٹوار کریں گے۔کیونکہ کروڑوں لوگوں کو آزادی دلوانے میں میرا بھی حصہ ہو گا۔کامل ہشام مسلمانوں کا لیڈر ہو گا۔ایک دنیا ہو گی جو میرا نام یاد رکھے گی۔تم بتاؤ گل تمھارے لئے خوش قسمتی کیا ہے۔“

”میرے لئے خوش قسمتی مختلف ہے۔میں نے اگر قافلے کے ایک فرد کے زخم پہ مرہم رکھا،اگر ایک بہن کے سر پہ چادر رکھی،ایک بھائی کو پانی پلایا،ایک ماں کو اسکے بیٹے کے لئے کھانا دیا،یا پھر ایک باپ کو اسکی جوان بیٹی کے لئے محفوظ چھت دے دی تو میں خود کو خوش قسمت سمجھوں گی۔“کامل زور سے ہنسا تھا۔

"پھر تم عظیم نہیں بن سکتی گل۔کوئی تمھیں یاد نہیں کرے گا۔کیونکہ تمھارے حصے میں کوئی عظیم کارنامہ نہیں آئے گا۔"اس نے بات کو ہوا میں اڑا دیا تھا۔

"کچھ کام،کچھ عمل صرف اللہ کے لئے ہوتے ہیں۔یہ دنیا یہاں ہمیں بھیجنے والا اللہ ہے۔یہ کہانی اللہ اور ہماری ہے۔باقی تمام لوگ تو غیر ضروری کردار ہیں۔۔اصل معاملہ اللہ سے ہے۔ اور وہ اپنے لئے لٹائے جانے والے خزانے بھی رد کر دیتا ہے،اور ایک پھوٹی کوڑی بھی قبول کر لیتا ہے۔کامل ہشام نیکی کا صلہ اللہ دیتا ہے۔لوگوں کی کیا اوقات؟"

"یہ بس فلسفے ہیں گل اصل زندگی مختلف ہوتی ہے۔یہاں آپ کی کہانی آپ کے کردار،لوگ ہوتے ہیں۔معاشرہ ہوتا ہے۔وہ اور دور ہوتا ہوگا جہاں کسی قسم کی کوئی نمائش نہیں تھی۔یہ وقت یہ دور،یہاں قیامت اور اللہ سے ملاقات کو دور کا معاملہ سمجھا جاتا ہے۔"وہ بول کر خاموش ہوا تو رعنا بھی کچھ نہ بولی۔

"خیر چلو آؤ تمھیں گھر چھوڑ آؤں۔"کامل اٹھ کھڑا ہوا،بینچ پہ بیٹھی گل رعنا کی جانب ہاتھ بڑھایا۔گل رعنا نے اس کی چوڑی ہتھیلی دیکھی،پھر آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔اس کی آنکھیں،گل رعنا کو یہ آنکھیں ساری دنیا کی آنکھوں سے خوبصورت لگا کرتی تھیں۔وہ بغیر تھکے،پہروں پہر انہیں دیکھ سکتی تھی۔

"کل رات جو کچھ بھی ہوا،اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا کامل ہشام۔میں بے قصور تھی۔" آہستگی،بے حد آہستگی سے اس نے کامل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے تم سے کوئی صفائی نہیں مانگی، رات گئی بات گئی۔ بھول جاؤ سب کچھ۔" اس نے بات ہوا میں اڑا دی۔

"کیا گل رعنا کو یونہی واپس چلے جانا چاہیے۔ کیا کامل ہشام میرے ساتھ، بوگی نمبر بارہ میں بیٹھ کر پاکستان نہیں جائے گا۔ مجھے دیکھیں کامل اور بتائیں۔ کیا میں چلی جاؤں۔" کامل نے نظریں چرا لیں۔

"تمھیں کیا لگتا ہے میرا دل کیا چاہتا ہے۔"

"دل کے معاملے میں دوسروں کی رائے نہیں لی جاتی۔ وہ اپنے فیصلے خود سنا دیتا ہے۔ اپنے دل پہ ہاتھ رکھیں، آنکھیں بند کریں اور سوال کریں۔" گھاس کے قطعے پہ کھڑے شخص نے اپنے دل پہ ہاتھ رکھا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ اسکی آنکھوں کے آگے مناظر ٹوٹے بکھرے تھے۔

"اے کامل ہشام کے سرمئی دل۔ تم اپنے مستقبل میں کیا دیکھتے ہو؟ گل رعنا کے ساتھ بوگی نمبر بارہ کا سفر، یا۔۔۔۔۔؟" اس نے آنکھیں پٹ سے کھول دیں۔ اب کے اس کی آنکھیں کسی بھی تاثر سے پاک تھیں۔ کھوکھلی بے جان۔

"تمھیں جانا چاہیے گل۔۔۔۔۔۔ تمھیں چلے جانا چاہیے۔" وہ غیر انسانی آواز میں کہہ کر ایک بار پھر رعنا کی جانب ہتھیلی بڑھا چکا تھا، جسے اس نے نہیں تھاما۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ نقاب کو ایک بار پھر یوں اوڑھا کہ بس آنکھیں نظر آتی تھیں۔ سیاہ، خوبصورت، ساحر آنکھیں۔ وہ اٹھ کر جا رہی تھی۔ اب اسے جانا ہی چاہیے تھا۔ ہاں واپسی کے سفر میں اس نے کامل کا ہاتھ نہیں تھاما تھا۔ قدموں میں لرزش تھی، مگر وہ کامل جیسے معذور کا ہاتھ نہیں تھام سکتی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

یہ وہ دور تھا جب ہندوستان میں جگہ جگہ فساد اور قتل و غارت عام ہو چکا تھا۔جہاں جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی،وہاں اب مسلمان گنتی کے بھی نہ رہے تھے۔کچھ وقت میں ملک آزاد ہونے والا تھا ہر کوئی جانتا تھا۔لیکن ہندو اور سکھوں کو یہ بات اپنی غیرت اور مردانگی پہ چوٹ لگی تھی۔سو انہوں نے وہ کیا جس کا ذکر کسی بھی قوم کا دل دہلا سکتا تھا۔مسلمان ہجرت کر رہے تھے۔گلی کوچے خالی ہونے لگے تھے۔ایک ایسی ہی خالی اور لمبی گلی میں اس وقت دو لوگ تھے۔

حویلی سے ذرا فاصلے پہ وہ دونوں تانگے سے اتر گئے۔تانگے والے کو روپے پکڑا کر،کامل اب رعنا کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔اسکا چہرہ سنجیدہ تھا۔

"آج شام میں اور اماں،بنارس جا رہے ہیں۔اماں کو گھر چھوڑ میں واپس دہلی چلا جاؤں گا۔چند دنوں میں ملک آزاد ہو ہی رہا ہے۔دہلی سے میرا اگلا سفر لاہور ہو گا۔"وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔رعنا غائب دماغی سے سنتی رہی۔

"کیا آپ مجھ سے ناراض ہیں۔؟" حویلی کے قد آدم دروازے کے پاس رک کر رعنا نے سوال کیا۔کامل نے اسے نہیں دیکھا۔

"ناراض ہونے والی کوئی بات نہیں ہے۔ایک رشتہ جسے میری اور تمہاری اماں بنا رہی تھیں وہ نہیں بن سکا۔اس میں ایسی کیا بات ہو گئی؟"

گل رعنا اس سے کہہ نہ سکی کہ رشتہ تو وہ دونوں بھی بنا رہے تھے۔ہاں کوئی عہد نہ ہوا تھا۔آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کوئی یقین دہانی نہیں کروائی گئی تھی۔لیکن کیا دلوں کے تعلق کو ان سب کی ضرورت ہوتی ہے؟

"کیا تم مجھ سے ناراض ہو گل۔۔۔؟"اس نے بازو سینے پہ باندھ لئے۔

"اس شخص سے کیا ناراض ہونا جو بات کرتے ہوئے آنکھیں چراتا ہو،بولتے ہوئے الفاظ بدل لیتا ہوں۔ایسے لوگوں پہ ترس آتا ہے۔اور مجھے آپ پہ جی بھر کر ترس آ رہا ہے۔جی چاہتا ہے آپ کو بھیک میں مردانگی دے دوں۔یا پھر گل رعنا جیسا حوصلہ اور ہمت۔" وہ زہر خند لہجے میں کہتی اندر چلی گئی اور کامل ہشام بس یونہی کھڑا رہا۔گلی میں کہیں سے بھجن کی آواز آتی تھی۔کامل نے لاکھ چاہا کہ اسے دہرا نہ سکے۔لیکن وہ بچپن کے گیت کی مانند ازبر تھا۔

حویلی کے اندر جاتے ہوئے اسے اماں نے دیکھا،پھر اسکے عقب میں چل کر آتے کامل کو دیکھا۔جو الفاظ منہ میں آئے تھے،انہیں واپس حلق میں دھکیل دیا۔کوئی سوال جواب نہ ہوا۔گل آنگن کی اور بڑھ گئی،کامل دوسری منزل پہ واقع اپنے کمرے میں چلا گیا۔صبح سے دوپہر ہوئی،دوپہر سے شام۔حویلی کے داخلی دروازے پہ آج رش سا تھا۔کئی خاندان،اور غیر خاندان کی عورتیں فریدہ ہشام سے گلے مل کر انہیں رخصت کر رہی تھیں۔کامل ہاتھ میں سفری بستہ لئے کھڑا تھا۔آنکھیں بے تاثر تھیں۔یوں گویا کبھی کسی جذبے نے چھوا تک نہ ہو۔کھڑکی میں کھڑی گل رعنا آج بھی بغیر کسی کی پرواہ کئے براہ راست اسے دیکھ رہی تھی۔اماں اسکے عقب میں کھڑی تھیں کہ ہمت نہ ہوتی تھی بھابی کا سامنا کرنے

کی۔نوری تاسف سے اپنی بڑی بہن کو دیکھ رہی تھی۔گل رعنا نے اسے ہمیشہ کہانیاں سنائیں تھیں۔لیکن آج کی کہانی میں کوئی امید نہیں تھی۔

”تیرے جیسی لڑکیاں ہوتی ہیں جو اپنے بخت کو ٹھوکر مار کر آتی ہیں۔ارے کمبخت اگر اس رات خاموش رہ جاتی تو یہ نہ ہوتا۔آج تو ہنسی خوشی کامل کے نام کا دوپٹہ اوڑھے بیٹھی ہوتی۔ملک آزاد ہو نہ ہو تو محبت کی غلام ہو گئی ہے رعنا۔“

”اماں جس کا اپنا کوئی نام نہیں وہ مجھے کیا نام دے گا۔جس کی اپنی خوشی کی ڈور کسی اور سے جڑی ہے۔وہ میرے ساتھ کیا ہنسے گا۔کامل ہشام ذہنی غلام ہے۔وہ آزاد ٹکڑے پہ جا کر بھی قید رہے گا۔ اور میں قفس میں رہ کر بھی آزاد۔کامل غلط کہتا ہے آزادی ہر ایک کے لئے نہیں ہوتی۔“

اماں کچھ بڑبڑاتے ہوئے سامان باندھنے لگیں کہ صبح فجر کے بعد نکلنا تھا۔گل رعنا یک ٹک لکڑی کے نقش و نگار والی کھڑکی سے لگی باہر دیکھتی رہی۔وہ آنگن میں کھڑا تھا پورے قد کے ساتھ۔وہ ایسا تھا کہ اسے دیکھ کر آنکھیں نہ تھکتی تھیں۔لیکن گل رعنا تھک رہی تھی۔ کمبخت کو جانا تھا تو جائے۔یہ جانے والے آخری ملاقات، آخری لمحہ کیوں متعین کرتے ہیں۔جب جانا ہی ہوتا ہے تو پھر سلامتی بھیجنے،اپنی وفائیں یاد کرانے کیوں آتے ہیں۔۔کیوں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر،ہجر کا پیغام سناتے ہیں۔کیوں آخری لمحے ان آنکھوں کے نظارے حفظ کرتے ہیں۔یا پھر انکی نمی دیکھ دل ہی دل میں کھلی اڑاتے ہیں۔کاش کبھی کسی کو جانے والوں کے یہ بدتمیزانہ آداب سمجھ آ سکیں۔کاش!

رعنا نے پلکیں جھپکیں تو چند موٹے موٹے آنسو ٹوٹ کر گرے۔اسی لمحے کامل نے نظریں اٹھائیں،اور اسی پل اسکی نظریں گل رعنا کی نظروں سے ملیں۔لکڑی کی قد آدم کھڑکی سے ٹیک لگائے، آنکھوں

میں نمی لئے وہ اسے دیکھ رہی تھی۔کامل چند لمحے اسے دیکھتا رہا،چند لمحے مزید،مزید چند لمحے اور پھر اس نے نظر پھیر لی۔نظر کا یہ پھیر لینا گل رعنا کے دل کو کاٹ گیا تھا۔پھر اسکے بعد وہ پلٹ گیا۔اس نے سفری بستہ کندھے پہ ڈالا اور پلٹ گیا۔

گل رعنا کئی لمحے سن ہوتے دل،شل ہوتے قدم،اور رکتی ہوئی سانسوں کے درمیان اس بیلوں سے ڈھکی کھڑکی سے لگی کھڑی رہی۔امرتسر خیانت کار تھا۔لاہور نے اسے زندہ دل گل رعنا دی تھی۔لیکن وہ خیانت کار اس کا دل توڑ کر اسے واپس بھیج رہا تھا۔کاش شہروں کے کوئی احتساب کی عدالت ہوتی،امرتسر کو پھر سزائے موت ہوتی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

اگلی صبح مصروفیت کی صبح تھی۔حویلی میں گہما گہمی معمول کی رہی۔کچھ لوگ سامان باندھے اپنے گھروں کو روانہ ہوئے۔کچھ کا قیام ابھی بھی لمبا تھا۔گل رعنا اور اس کی ماں صبح ناشتہ کرنے کے بعد اب نیم اندھیرے میں ریل اڈے کی جانب روانہ ہونے لگے تھے۔کئی بار اسکا دل چاہا تھا کہ ان زینوں پہ جا کر بیٹھے۔آج کامل کے حصے کی چائے بھی خود پیئے۔لالٹین کی زرد روشنی میں آج اسکا چہرہ نہ دیکھ پائی تو کیا ہوا۔تصورات کی دنیا تو بہت وسیع ہے۔وہ اسکے سامنے بیٹھ بھی سکتی تھی۔اسے دیکھ بھی سکتی تھی۔کئی سارے شکوے،رنج،تفکرات اور سب سے بڑھ کر ویران دل لئے گل رعنا نے مٹیالی حویلی کو الوداع کہا تھا۔تانگے میں بیٹھتے ہوئے اسے کامل کی گاڑی یاد آئی تھی۔ سڑک پہ کھانوں کی خوشبو سونگھتے ہوئے اسے لاہوری پلاؤ یاد آیا تھا۔

تانگہ ہچکولے کھاتا امرتسر کی سڑکوں پہ دوڑ رہا تھا۔اماں کہتی تھیں اللہ کی زمین ہے جیسی یہاں ویسی وہاں۔لیکن لاہور نے تو کبھی گل رعنا کا دل یوں اداس نہیں کیا تھا۔ریل اڈے کی پیلی بینچ پہ بیٹھی وہ آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔نوری اپنے ریڈیو کے ساتھ چھیڑ خانی کر رہی تھی۔اسے دنیا بھر کے چینلز پہ چلتی بولیاں سننے کا شوق تھا۔بات چاہے خالص انگریزی میں ہو رہی ہو،یا پھر ٹیڑھی فرینچ میں اسے سب سننا تھا۔ریڈیو کی گھر گھر کی آواز اب تھم چکی تو آوازوں کا راستہ صاف ہوا۔اور جو پہلی آواز،خبر سننے کو ملی وہ یہ تھی۔

"تمام مسلمان بہن بھائیوں کو مطلع کیا جاتا ہے کہ ملک بھر میں دنگے اور فساد حد سے بڑھنے لگے ہیں۔لہٰذا اپنے جان و مال کی حفاظت کریں۔آپ سب۔۔۔۔۔۔"ریڈیو سے نکلتی آواز یکدم دب گئی۔زمین گویا لرزنے لگ گئی ہو۔یوں جیسے ایک بھاری تعداد والی فوج نے یہاں کا رخ کر لیا ہو۔شور ایسا شور اٹھا کہ کانوں کے پردے پھٹتے محسوس ہوئے۔

"واہے گرو دا خالصہ۔۔۔۔واہے گرو دی فتح۔۔۔۔۔"

بھڑکیلے شوخ رنگوں کے کرتے،سر پہ باندھی پگڑیاں اور تہبند باندھے امرتسر کے سکھ ہاتھوں میں چھری،چاقو،تلوار،لاٹھیاں لئے آ رہے تھے۔انکے چہروں سے نفرت ٹپکتی تھی۔انکی آنکھیں لہو چھلکاتی تھیں۔یکدم اماں نے ان دونوں کا ہاتھ پکڑا اور بھاگنے لگیں۔انکے عقب میں چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔وہ لوگ چن چن کر مسلمانوں کو مار رہے تھے۔ایسی بے دردی سے کہ کلیجہ پھٹ پڑے۔ایسی درندگی سے کہ درندے بھی خوف کھائیں۔چیخوں،کراہوں کی آوازیں دب جاتی تھیں۔لیکن انکے نعرے نہ دبتے تھے۔

"واہے گرو دا خالصہ۔۔۔۔۔واہے گرو دی فتح۔۔۔" تمام سکھ بلند آواز میں نعرے لگاتے جاتے،اور انسانوں کے جسموں کے اندر چاقو، چھریاں گھساتے جاتے۔لوگوں کے سر ان کے جسموں سے الگ ہو رہے تھے۔خون۔کٹے ہوئے اعضاء یکدم ریل اڈے کا منظر ہی بدل کر رہ گیا تھا۔

ایک بوڑھی ماں اپنی دونوں بیٹیوں کے ہاتھ تھامے بھاگ رہی تھی۔گل رعنا کا چہرہ خوف سے سفید پڑ رہا تھا۔قدم لرز رہے تھے۔لیکن وہ بھاگ رہی تھی،اندھا دھند بھاگ رہی تھی۔وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہی تھی۔یہ لوگ مردوں کو قتل کرتے تھے،اور عورتوں کو اٹھا لیتے تھے۔گل رعنا کا دل ایک پتے کی مانند لرز رہا تھا۔اسے موت قبول تھی یہ زندگی نہیں۔اشتعال زدہ ہجوم انکے بے حد قریب تھا۔جب اماں ان دونوں کا ہاتھ پکڑے فوراً ریل اڈے پہ بنے ٹکٹ گھر میں گھس گئیں۔باہر سے اب بھی لوگوں کے چیخنے،رونے،بد دعائیں دینے کی آوازیں آتی تھیں۔

"کہاں ہے تمہارا جناح۔۔۔۔۔کہاں ہے تمہارا اقبال بلاؤ۔۔۔۔۔خدا کو بلاؤ۔۔۔۔۔۔۔اپنے الگ وطن جاؤ گے۔۔۔۔۔ساری زندگی یہاں غلامی کی ہے اب چلے ہیں وطن بنانے۔۔۔۔یہاں سے زندہ جاؤ گے تو وطن بناؤ گے ناں۔" آوازیں۔۔۔رعنا کے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔پسینہ،خوف،غیرت وہ ملے جلے تاثرات کے ساتھ اس ڈربے نما دفتر میں میز کے نیچے بیٹھی تھیں۔اسے آج موت سے خوف نہیں زندگی سے خوف محسوس ہوا تھا۔باہر سے آتی آوازیں لمحہ بالمحہ تیز ہوتی جاتی تھیں۔آج اسے معلوم ہوا تھا غیر ملک کیا ہے۔اپنے دینی لوگوں کی کثرت نہ ہونا کیا ہے۔اسی لمحے تین خوف زدہ عورتوں نے قدموں کی چاپ سنی۔

نوری رونے لگی تھی۔اماں نے فورا اپنے دوپٹے کا پلو اسکے منہ میں ٹھونس لیا۔رعنا نے اپنے دونوں ہاتھ منہ پہ رکھ لئے۔اسے امرتسر آنا حماقت لگی،اسے اپنی کہانی میں اپنی موت نظر آئی۔آنسو اسکی آنکھوں سے بھل بھل بہہ رہے تھے۔اس نے بے اختیار ایک ہچکی لی،اور اسی ہچکی کے ساتھ دفتر کا دروازہ کھلا زرد کرتے پہ سرخ خون کے دھبے لئے ایک سکھ اندر داخل ہوا۔اسکے آگے پیچھے تین چار اور مرد اندر داخل ہوئے۔اب کہ اماں کے ساتھ ساتھ انکی دونوں بیٹیوں کے اوسان واقعتاً خطا ہوئے تھے۔

"بڑھیا۔۔۔یہاں چھپی بیٹھی ہے۔کیا لگا تھا پاکستان کی ٹکٹ کرائے گی۔کیا لگا تھا یہاں سے زندہ سلامت جائے گی۔" انہوں نے نیچے جھک کر تینوں کو گھسیٹ کر باہر نکالا۔اماں چیخ رہی تھیں۔اپنی بیٹیوں کو ان جانوروں سے چھڑوا رہی تھیں۔بڑی بڑی مونچھوں والے ایک سکھ نے نوری کو اپنے کندھے پہ اٹھا لیا۔گل رعنا کا دل اچھل کر حلق میں آیا تھا۔اسے بازو سے گھسیٹ کر لے جانے والے آدمی کو وہ زور زور سے مکے مار رہی تھی۔جس کا اس بے حس پہ کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔

"میری بہن کو چھوڑو۔۔۔۔تمھیں تمھارے خدا کا واسطہ ہے،خدا کے لئے میری بہن کو چھوڑو۔ "کرخت چہرے والا سکھ اسے بالوں سے گھسیٹ کر اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔اماں کو ان لوگوں نے اب تک نرغے میں لے رکھا تھا،چند ایک اور عورتیں بھی تھیں جن کی بے بسی کا تماشا یہ بے حس لوگ دیکھ رہے تھے۔

نوری کی چیخیں،خون میں لپٹے لوگ،فرش پہ جگہ جگہ پڑے کٹے ہوئے اعضاء ان سب کے درمیان گل رعنا نے وہ منظر دیکھا جسے وہ ساری زندگی نہیں بھلا سکتی تھی۔نارنجی چولے والے سکھ نے ایک تیز دھار چاقو اسکی ماں کے سینے میں گھونپ دیا۔پھر اسکی پسلیوں میں،پھر پیٹ میں،اور پھر ایک بار پھر

سینے میں۔اب کے وہ رکا نہیں۔وہ دھڑا دھڑ اس تیز دھار چاقو سے اس ادھیڑ عمر عورت کے جسم میں سوراخ کرتا چلا گیا۔یہی حال باقی عورتوں کا تھا۔

گل رعنا کا جسم یکدم ڈھیلا پڑ گیا، آنکھیں خالی، اور لب ہلکے سے وا رہ گئے۔اسکی کلائی بے سانس ہوئی، اور جس شخص نے اسے پکڑ رکھا تھا، وہ بے سانس کٹی پتنگ سی اسکے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پہ گر گئی۔اماں آخری سانسیں لے رہی تھیں۔رعنا سانس بھی نہ لے سکی۔وہ زمین پہ، خون سے لت پت زمین پہ بے حس و حرکت پڑی تھی۔اسکے سر پہ کھڑا سکھ اسکے پیٹ، ٹانگوں پہ لات، ٹھڈے مار رہا تھا۔لیکن ہر تکلیف ختم ہو گئی تھی۔اس کی ماں آخری سانسیں لے رہی تھیں۔وہ بلکل اسی سیدھ میں بے سدھ پڑی تھیں، جس سیدھ میں گل رعنا۔دونوں کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ایک کی آنکھیں کچھ پل میں بند ہو جاتیں ہمیشہ کے لئے۔اور ایک کی آنکھیں کبھی نہ بند ہونے کے لئے کھلی رہتیں۔

اسی اثناہ میں مسلمانوں کا ایک گروہ بھی نعرہ تکبیر کے نعرے بلند کرتا یہیں آیا تھا۔انکے ہاتھوں میں ایسے خنجر، ایسی چھریاں، ایسی تلواریں نہیں تھیں۔کچھ نہتے تھے، کچھ کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں۔اور کچھ کے ہاتھوں میں پتھر۔نارنجی چولے والا سکھ اب نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔گل کو معلوم نہ ہو سکا۔ایک مسلمان لڑکا اب نوری کو اسی سکھ سے چھڑا رہا تھا۔کیوں؟ کیسے گل کو اندازہ نہ ہو سکا۔

دو گروہ آپس میں بھڑ پڑے تھے۔کون حاوی تھا، کون پس رہا تھا۔گل جان نہ سکی۔اس کی ماں اس کے سامنے تڑپ رہی تھی، رفتہ رفتہ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔گل کے دل پہ جیسے دھکا لگا تھا۔وہ سکتے کے عالم میں پتھرائی آنکھوں سے اس منظر کو دیکھ رہی تھی۔نوری اس سے لپٹ کر رو رہی تھی۔اسکی ماں مر گئی تھی۔گل رعنا کو لگا ساری آوازیں، سارے لوگ، سارے قصے، ساری زمین۔بلکہ ساری

کائنات نے آخری سانس لے لی ہو۔کئی لمحے بعد وہ اٹھی تھی۔اسکے آس پاس جنگ سی چھڑی تھی۔دو گروہ ایک دوسرے کو کاٹ رہے تھے۔چیر رہے تھے۔خون کی ہولی تھی،اور چیخوں کراہوں کی دیوالی ان سب کے درمیان وہ خود کو گھسیٹتی ہوئی اپنی ماں کے قریب لے جا رہی تھی۔چند پل قبل اسے کوئی مرد بھی یونہی گھسیٹ رہا تھا۔لیکن یہ تکلیف اس تکلیف کے آگے کچھ نہیں تھی۔مٹی سے اٹے خون میں لت پت کپڑے،بکھرے بال اور ننگے سر وہ اپنی ماں کے قریب تھی۔

انکی آنکھیں کھلی تھیں۔شاید اپنے بیٹے کی راہ تک رہی تھیں۔جسم جگہ جگہ سے پھاڑ دیا گیا تھا۔رعنا نے آہستگی سے انکی آنکھیں بند کر دیں۔اور وہ بند ہو گئیں۔پھر اس نے انکا فربہہ ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔آنسوؤں کے چند قطرے انکے ہاتھ پہ گرے۔اس نے اس ہاتھ کو اپنی آنکھوں سے لگایا۔پھر دھیرے سے لبوں سے چھوا۔اسے محسوس ہوا کہ اسکا سارا بدن لرزش کا شکار تھا۔اماں کا ڈوپٹہ فرش نشین تھا۔اس نے دوپٹہ اٹھا لیا اور اپنی ماں کے جسم پہ اوڑھ دیا۔

ملک،خطے،قومیں آزادی کی قیمت چکاتی ہیں جیسے گل رعنا چکا رہی تھی۔اپنی ماں کا چہرہ ڈھکتے ہوئے اسکے لبوں سے دھیرے سے چند الفاظ ادا ہوئے تھے۔"اللہ کے حوالے کیا۔۔۔۔میں نے اپنی ماں کو اللہ کے حوالے کیا۔"

آگے اسے کچھ یاد نہیں تھا۔وہ بس اوندھے منہ زمین پہ گر پڑی تھی۔بس اسکی آنکھیں بہہ رہی تھیں۔بس اسکی بہن رو رہی تھی۔گل نے آخری منظر بس اپنی ماں کی بند ہوتی آنکھوں کا دیکھا تھا۔پھر رفتہ رفتہ اسکی بصارت دھندلی پڑنے لگی،آنکھوں پہ بوجھ پڑا،دماغ غائب ہونے لگا اور چند ہی لمحوں میں وہ ہوش سے بے گانہ تھی۔تاریکی،سکون اور گمنامی میں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

جس جگہ اسکی آنکھ کھلی وہ کوئی کیمپ تھا۔لکڑی کے پھٹے پہ پڑے پڑے اس کا جسم اکڑ گیا تھا۔اس نے کروٹ بدلنی چاہی لیکن درد شدید تھا۔اس نے آنکھیں کھولنی چاہیں لیکن بصارت دھندلی تھی۔اسکا گلا خشک ہو رہا تھا۔کوئی وجود تھا جو اسے آپا پکار رہا تھا۔کوئی وجود تھا جس نے وردی پہن رکھی تھی۔وہ اسے گڑیا پکار رہا تھا۔رعنا نے ذرا کی ذرا نظر کھولی اسکا بھائی اس کے سامنے کھڑا تھا۔وہ اس کے گال تھپتھپا رہا تھا۔

”میرا بیٹا میرا مراد آئے گا۔تو ہم قورمہ بنائیں گے۔مراد آئے گا تو ہم پنڈی چکر لگائیں گے۔“

گل رعنا نے آنکھیں جھپکیں،مناظر صاف ہوئے وہ آگیا تھا۔وہ اب آیا تھا جب اسکی راہ تکتی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔

” جانے والوں کی راہ میں آنکھیں نہیں لگاتے اماں۔ورنہ سفر لمبے ہوجاتے ہیں،آنکھیں تھک جاتی ہیں،دل پھٹ پڑتے ہیں آنے والوں کو اپنی مرضی کرنے دیں اماں۔“اس کے ذہن میں اپنی اور اماں کی باتیں گونج رہی تھیں۔پھر لوگوں کی کراہیں،خون،لاشیں۔اماں کا چہرہ۔اور یہاں اسکی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو ٹوٹ کر گرے۔اس نے آنکھیں گھمائیں،نوری اس کے سرہانے کھڑی تھی۔روئی روئی آنکھیں۔گال پہ آنسوؤں کے نشان۔مراد اسکے پاس تھا۔فکرمندی سے اس کو تکتا ہوا۔ان دونوں چہروں پہ ایک چہرہ غالب آگیا۔اسکی اماں کا آخری چہرہ۔

اللہ جانے کمبختوں نے قبر دی ہوگی کہ شمشان گھاٹ۔دل ایک بار پھر پسیجنے لگا۔آنسوؤں میں تیزی آنے کے بجائے ختم ہو گئے۔اس نے آنکھیں موند لیں۔ذہن پہ بوجھ بڑھنے لگا اور آنکھیں بھاری پڑیں۔کوئی منظر اسکی آنکھوں کی تاب نہ بجھا سکتا تھا۔وہ ایک بار پھر غنودگی میں چلی گئی۔

اگلی بار جب اسکی آنکھ کھلی تو جسم کے نیچے سے تختہ غائب تھا۔وہ ٹاٹ کے پیوند زدہ چٹائی پہ پڑی تھی۔خیمے سے جھلستی ہوئی دھوپ سارے خیمے میں گرمی پھیلا رہی تھی۔کئی لمحے وہ یونہی ساکن پڑی رہی۔گردن موڑ کر دیکھا تو نوری اس کے دائیں طرف لیٹی تھی۔بغیر کسی تکیے،بغیر کسی چٹائی کے۔مٹی پہ پڑا اس کا بدن پسینے سے تر تھا۔گل رعنا کے دل کو جیسے کسی نے برچھی سے چیر دیا ہو۔نقاہت اتنی تھی کہ وہ اٹھ بھی نہ سکتی تھی۔ذرا سی جدو جہد کے بعد وہ اٹھ بیٹھی۔پاس ہی گدلے سے جگ میں پانی پڑا تھا،اس نے جگ منہ سے لگا لیا اور غٹا غٹ سارا پانی پی گئی۔اسکے کپڑے میلے تھے۔بال گویا چپک گئے ہوں۔چہرہ یوں جیسے صدیوں کی کوئی بیمار۔دیوانہ وار پانی پیتے ہوئے اسکی گردن گیلی ہو گئی۔

اسی لمحے خیمے کا پردہ وا ہوا،اور مراد اندر آتا دکھائی دیا۔گل رعنا کو یوں بیٹھے دیکھ وہ دیوانہ وار اسکی جانب لپکا تھا۔

”تم ٹھیک ہو رعنا؟تم ٹھیک ہو گڑیا؟میرے اللہ کا شکر ہے کہ تم ٹھیک ہو۔“وہ اس کے گال تھپتھپا رہا تھا۔وہ ساکت بیٹھی رہی۔جسم میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔اس نے آنکھیں جھپک کر کھولیں۔چند آنسو ٹوٹ کر گرے۔

”میں نے تمھارے ٹھیک ہونے کا انتظار کیا ہے رعنا ،خدا کا شکر ہے تم ٹھیک ہو۔“

"اماں مر گئیں مراد۔۔۔میں نے اسے اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے ہوئے دیکھا۔۔۔تم نے اماں کو دیکھا؟" اسکی آواز ہلکی تھی، بے حد ہلکی۔مراد نے لب بھینچ لئے گویا ضبط کرنا چاہتا ہو۔آنکھیں سرخ پڑنے لگیں۔

"اماں مری نہیں ہیں رعنا۔اماں شہید ہوئی ہیں۔تو فکر نہ کر۔وہ ہم سے بہتر جگہ ہو گی۔اللہ نے اسے قربانی کے لئے چن لیا تھا۔"

"مجھے اماں کو دیکھنا تھا مراد۔اماں مجھے چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہیں۔اماں کو آنا چاہیے ناں؟" وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں اسکے چہرے پہ جمائے پوچھ رہی تھی۔مراد نے دھیرے سے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

"جانے والوں کی راہ میں آنکھیں نہیں لگا لیتے۔ورنہ سفر لمبے ہو جاتے ہیں، آنکھیں تھک جاتی ہیں اور دل پھٹ پڑتے ہیں۔جانے والوں کو انکی مرضی کرنے دیا کر رعنا۔"

وہ کمبخت کہاں اور کس جگہ اس کے الفاظ اسے واپس لوٹا رہا تھا۔گل رعنا کا جی چاہا تھا چیخ چیخ کر روئے، ساری دنیا کو بتائے کہ ان کے ساتھ ظلم ہوا ہے۔اپنے بھائی کے سینے سے سر لگائے وہ بس ساکن بیٹھی رہی۔مراد روتا رہا، اپنے سفر کی داستان، فوج کے قصے، تن کی سختی وہ نہ آنے والا اب بہانے بنا رہا تھا۔رعنا چپ چاپ سنتی رہی۔ایک پل کو دل میں خیال آیا تھا کہ کامل ہشام کہاں ہو گا۔اس خیال نے دل کو اندر تک چیر دیا تھا۔پھر اماں کا چہرہ یاد آیا اور یہاں ہر درد ختم ہو جاتا تھا۔

کچھ دیر بعد خیمے میں بچھے ٹاٹ پہ وہ تینوں بہن بھائی بیٹھے تھے۔مراد اسے پچھلے دنوں کی باتیں بتا رہا تھا۔

"مجھے اسی ریل اڈے سے واپس لاہور جانا تھا، جہاں تم سب تھے۔ میں جب اپنے فوجی دستے کے ساتھ وہاں پہنچا تو مجھے نوری نظر آئی۔ اماں نے مجھے خط لکھا تھا۔ خاص طور پہ تاکید بھی کی تھی کہ اس بار چند دنوں کی چھٹی لے کر حویلی آ کر ان سے مل لوں۔" اماں کے ذکر پہ اس نے نوالا واپس رکھ دیا۔ نوری ٹکر ٹکر اس کا چہرہ دیکھے گئی۔ گل رعنا نے اسے بھی کھانا چھوڑتے دیکھا تو اپنا بنایا نوالہ اسے کھلانے لگی۔ وہ اب رعنا نہیں تھی۔ اب وہ اماں بھی تھی۔

"میں نہیں آ سکا گڑیا۔ مجھے آنا چاہیے تھا۔ وطن آزاد ہو نہ ہو، میں ساری زندگی ضمیر کی قید میں رہوں گا۔ میں نے اپنی اماں کی بات نہیں مانی۔ میں کس منہ سے واپس جاؤں۔ میں ابا کو کیا منہ دکھاؤں گا؟" اس نے نوالا رکھ دیا۔ سر کو ہتھیلی پہ گرائے وہ دھیمی آواز میں گریہ کر رہا تھا۔

"ہم یہاں کتنے دنوں سے ہیں؟" وہ بے تاثر لہجے میں بولی تو مراد نے اپنی آنکھیں صاف کیں۔

"ایک ہفتہ ہو گیا ہے۔ اماں کے بعد شاید تجھے کچھ ہو گیا تھا۔ میں نے ایک ہفتہ تیرے ہوش میں آنے کی دعائیں کی ہیں گڑیا۔ پہلے چار دن تو بخار کا زور ہی نہ ٹوٹا، پھر بڑی مشکلوں سے بخار اترا۔ یہ کیمپ ہے رعنا۔ یہاں سارے ہندوستان کے مسلمان جمع ہیں۔ ایک دو روز میں قافلہ نکلے گا۔ ہم لاہور جائیں گے رعنا۔ تجھے لاہور کی کنیت میں پاکستان کا نام دیکھنا تھا ناں۔ خواب پورے ہو رہے ہیں۔ قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی۔ تو کچھ کہتی کیوں نہیں۔۔ کچھ بول دے خدا کے لئے کچھ بول۔" وہ اسکی مسلسل خاموشی سے پھٹ پڑا تھا۔ جوان بہن سات روزہ بے ہوشی سے اٹھی تھی اور اب منہ سی لیا تھا۔ دل نہ دکھتا تو کیا ہوتا۔

"جانتا ہوں اماں کی موت نے تیرے دل پہ گہرا اثر چھوڑا ہے۔ میں۔۔۔"

"اماں مری نہیں ہے۔اماں کو میں نے اللہ کے حوالے کیا ہے۔اماں نے قربانی دی ہے۔میں جوگ لے کر نہیں بیٹھی۔شہیدوں کے گھرانے صابر ہوتے ہیں۔میں نے صبر کر لیا ہے۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

"پھر تم بولتی کیوں نہیں ہو آپا۔میں تمھیں ایسے نہیں دیکھ سکتی۔مجھے دکھ ہوتا ہے۔" نوری سارے وقت میں پہلی بار بولی تھی۔رعنا نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔پھر اپنے سامنے بیٹھے مراد کو دیکھا۔

"کیا تجھے افسوس ہے رعنا؟کیا میری طرح تیرا ضمیر بھی قیدی ہو گیا ہے؟"

گل رعنا چند پل خالی خالی آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہی۔آنکھوں کی جوت آج بجھ گئی تھی۔گردن جھکا دی۔رعنا نے آج پہلی بار گردن جھکائی تھی۔

"میرا ضمیر قیدی نہیں ہے۔گل رعنا کا دل بے عیب ہے۔لیکن ایک پھانس ہے جو چبھ سی گئی ہے۔جن مقاصد کے لئے،جن عزائم،جن نظریوں کے لئے ہزاروں مائیں،بہنیں اور بھائی قربان ہوئے۔کیا پاکستانی انکی لاج رکھ لیں گے۔" الفاظ تھے کہ سیسہ،مراد جل کر خاک ہوگیا۔آس پاس گویا سکوت چھا گیا۔اس نے گردن اب تک جھکا رکھی تھی۔

"خوف آتا ہے کہ اگر ستر سال بعد زندہ رہے تو کیا پاکستان ویسا ہو گا جیسا ہم نے سوچا تھا؟یا پھر لاہور کے لوگ نارنجی چولے والے سکھ بن جائیں گے۔اور بیٹیوں کی عزت خراب کریں گے۔

کہیں سندھ کے لوگ دہلی کے امراء تو نہ بن جائیں گے۔کہ غریبوں کے حق پہ ڈاکے ڈالنے لگیں۔بلوچستان کہیں قافلے لوٹنے والوں میں سے تو نہیں ہو گا ناں؟اور خیبر والے ذات پات کا فرق تو

نہیں کریں گے ناں؟"۔بولتے بولتے اسکی آنکھیں چھلک پڑیں اس نے گردن اٹھائی۔ساکن بیٹھے مراد کو دیکھا۔اسکی آنکھیں خوف زدہ تھیں۔گل رعنا انسانوں سے خوف زدہ ہوگئی تھی۔

"ایسا نہیں ہوگا ناں مراد؟پاکستان ایسا نہیں ہوگا ناں؟یہ لوگ ہماری قربانیوں کی لاج رکھ لیں گے ناں؟"

"ہمارا پاکستان ایسا نہیں ہوگا رعنا۔ہمارے حوصلے،قربانیاں،عزائم لاہوری انکی قدر کریں گے،بلوچستان والے اپنے بچوں کو ہمارے قصے سنائیں گے۔اور خیبر مساوات کا علمبردار ہوگا۔ہماری بھوک رائیگاں نہیں جائے گی۔سندھ ہر مہاجر کی دعوت کرے گا۔"ایک بھائی اپنی بہن کو دلاسا دے رہا تھا۔

خدا اس کے الفاظ کو سچائی دے۔

☆☆☆☆☆☆☆

اگلے چند دن بے حد بے سکونی کے تھے۔رمضان شروع ہو چکا تھا،بلکہ اب تو اپنے اختتام کو جا رہا تھا۔کیمپ میں دن عجیب بے کلی میں گزرتے تھے۔اگست کی دھوپ جب پلاسٹک کے خیمے سے ٹکراتی جسم جھلساتی تھی تو گل رعنا کو اپنے گھر کی جھلی پنکھی یاد آتی تھی۔کس طرح وہ ناشکری کرتی تھی۔کس طرح وہ اماں ابا کو غربت کے طعنے دیتی تھی۔کیمپ اسے سب یاد دلا رہا تھا۔اچھا برا،سب۔

صبح ہوتی تھی تو قافلے کے امیر کچھ نوجوان لڑکے چائے اور سوکھی روٹی کا انتظام کر آتے تھے۔کبھی کوئی امیر مسلمان مدد کر دیتا،تو کبھی مسلم لیگ معملات سنبھال لیتی تھی۔حقیقی معنوں میں تو مسلم لیگ اپنے فرائض اب ادا کرنے لگی تھی۔سفید کرتے والے عظیم رہنما لوگوں کی داد رسی کرتے،بہنوں کے

سروں پہ ہاتھ رکھتے اور ماؤں کو دلاسا دیتے تھے۔بے رنگ پھیکی چائے دیکھ گل رعنا کو امرتسر کی وہ چند صبحیں یاد آتی تھیں۔وہ لال ٹین کی روشنی،وہ گاڑھے دودھ کی بنی چائے۔کچھ اور بھی تھا جو یاد آتا تھا۔لیکن دل کو ڈپٹ کر سلانے کے معاملے میں گل رعنا کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

دوپہر کے کھانے میں پانی سے زیادہ پتلی دال نصیب ہوتی تھی اور روٹی کبھی آدھی تو کبھی پوری۔رعنا خیمے کے باہر کھڑی لوگوں کو روٹی کے ٹکڑوں پہ لڑتے ہوئے دیکھتی تھی۔جنہیں مکمل روٹی مل جاتی انکے چہرے خوش ہو جاتے اور کچھ آدھی ادھوری روٹی لاتے ہوئے مایوس رہتے تھے۔ان دنوں وہ ایثار کا جذبہ بھی دیکھتی تھی۔عورتیں دوسری عورتوں کو اپنے خیمے آنے کا کہتی تھیں۔

”بہن اپنے بچے کو میرے خیمے میں لٹا دو،تمہارا تو اب تک دھوپ میں جھلس رہا ہے۔“

قربانی تو ان لوگوں پہ ختم ہوتی تھی۔جب رعنا کسی توانا مرد کو آدھی روٹی کھا کر آدھی دان کرتے ہوئے دیکھتی تھی۔”بھائی۔۔۔ہمارا پیٹ بھر چکا۔یہ روٹی تم اپنے بچے کو کھلا دو۔کب سے ننھی جان بلک رہا ہے۔“تشکر کے وہ آنسو،مصیبتوں سے نکلنے کی وہ امید رعنا کے دل کو موم کر دیتی تھی۔

شام میں سارے مرد خیموں سے نکل کر ذرا آگے میدان میں جا بیٹھتے تھے۔جہاں وہ رات دیر تک رکھوالی کیا کرتے۔ایک جاگتا تو ایک سوتا تھا۔مستقبل کے عزم بنائے جاتے تھے۔ماضی کے قصے دہرائے جاتے تھے۔چائے کی پیالی نہ سہی پانی کے گلاس پہ بھی گھنٹے گزر جاتے تھے۔۔عورتیں ایک جگہ ٹولی بنا کر بیٹھ جایا کرتیں اور اپنے غم سناتیں،کوئی جائیدادیں چھوڑ آئی تھیں،کسی نے گھر والوں کی جان کھوئی تھی۔کئیوں کی عصمت دری کی گئی تھی۔لیکن بلا کے حوصلے تھے جو آج بھی نہ ٹوٹتے تھے۔ایسے قدم تھے جو اب بھی واپسی کے بجائے آگے بڑھنے کو تیار تھے۔وہ جب کسی سولہ سترہ برس

کی لڑکی کے چہرے پہ اداسی دیکھتی تب اسے کامل یاد آتا تھا۔دل سے خون رسنا کیا ہوتا ہے اسے معلوم ہوجایا کرتا تھا۔

مہاجر کیمپ میں دن تو گزر جاتے تھے رات نہ کاٹے کٹتی تھی۔کیڑے مکوڑے فرش پہ رینگتے ہوئے کبھی اس کے پیروں سے چمٹ جاتے، کبھی گردن سے۔وہ آدھی رات کو اٹھ اٹھ کر لال ٹین کی روشنی میں آس پاس گہری نظر دوڑاتی کہیں نوری کو مچھر تو نہیں کاٹ رہے۔کہیں کوئی بچھو تو آس پاس نہیں۔راتیں لمبی تھیں۔شاید بس رعنا کے لئے ہی لمبی تھیں۔ورنہ باقی لوگ تو سوئے پڑے رہتے تھے۔بس وہی تھی جو آدھی رات کو جاگ جایا کرتی،اور پھر خیمے سے باہر نکل کر لالٹین کی روشنی میں گھنٹوں بے مقصد بیٹھی رہتی۔کبھی اسے کوئی ادھ کھانا کھایا مرد بھوک کے مرے ٹہلتا دکھتا،تو کبھی کوئی ماں اپنے دودھ کے لئے روتے بچے کو تھپک رہی ہوتی۔کیمپ کے ہر چہرے پہ ہر دوسرے دن مختلف تاثر ہوتا۔ایک دن کا بھوکا اگلے دن سیر ہوتا۔چائے کے نشئی اگلے دن چمکتے چہرے لئے ہوتے چند تاثر تھے،چند جذبے تھے جو مشترکہ تھے۔

امید۔۔۔۔اس خیمے سے نکل کر ایک چھت ملنے کی امید،ادھ بھوکے پیٹ کو کسی اچھے کھانے کی امید،تپتے جھلستے بدن کو اپنے وطن کی ہوا کی امید،یوں دربدری کے بعد ایک کچے مگر اپنے صحن کی امید،ایک لمبا عرصہ غلامی،ظلم و بربریت میں گزار کر اپنے پاکستان جانے کی امید۔

اسی امید کو سینے میں دبائے آج ایک قافلہ لاہور کو روانہ ہوا تھا۔کیمپ کے لوگوں کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔جوان مرد بوڑھی ماؤں کو کندھے پہ اٹھائے ہوئے تھے۔نو عمر لڑکوں نے چھوٹے بہن بھائیوں کے ہاتھ تھام رکھے تھے۔باپ بیٹیوں کے شانہ بشانہ تھے اور بھائیوں نے چاروں

اور سے قافلے کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ایک لمبا راستہ تھا جو طے کرنا تھا،لیکن مجال ہے کہ قدم تھکے ہوں۔مجال ہے جو قافلے نے ذرا دیر کو ستانا چاہا ہو۔

گل رعنا اور اس کا کنبہ بھی اس قافلے کے ساتھ تھا۔مراد نے نوری کو اپنی پشت پہ لاد رکھا تھا،اور رعنا کو اپنے ساتھ لئے چل رہا تھا۔ذرا ذرا سی آہٹ پہ اسکا ہاتھ جیب میں رکھی چاقو تک چلا جاتا تھا۔وہ دو بہنوں کے ساتھ تھا۔پتے چرچراتے تو اسے طوفان کا گمان ہوتا تھا۔اسی لمحے مغرب کی اذان کی صدائیں بلند ہوئیں۔کئی روزہ دار اپنی مشک میں بھرے پانی سے گلہ تر کرنے لگے تھے۔راستے میں کئی جگہ پانی کے بڑے بڑے کین بھی نظر آئے تھے کہیں ٹھنڈے مٹکے۔اس پہر بھی پانی کے کئی ٹھنڈے مٹکے قافلے کے سامنے تھے۔

روزہ دار،اور بچے بوڑھے پانی دیکھ مچل اٹھے تھے۔ہر ایک اپنی پیاس بجھانا چاہتا تھا۔سو بھر بھر کر پانی پیا۔سب سے پہلے مردوں،اور بچوں کو پانی پینے دیا گیا۔جونہی مرد حضرات پانی پی کر پیچھے ہوئے،عورتیں آگے آنے لگیں لیکن پانی پینا شاید انکا بخت نہیں تھا۔

مرد اور بچے خون تھوک رہے تھے۔چند عورتیں اور لڑکیاں جنہوں نے پانی پی لیا تھا،انکی آنکھیں ابلنے کو تھیں۔پانی میں زہر تھا۔اور اب لوگوں کے چہرے سبز پڑ رہے تھے۔تاریخ دان لکھیں گے کہ 1947 میں ظلم و بربریت کی داستان رقم کی گئی۔فسادات ہوئے،قتل و غارت ہوئے۔دنگے ہوئے۔لیکن تاریخ دان اگر خون تھوکتے ان مسلمانوں کو دیکھ لیں،ان کی عصمت لٹا کر آئی بہنوں اور چاقو چھریوں سے زخمی بھائیوں کے بدن دیکھ لیں تو کچھ مختلف لکھیں گے۔پھر تاریخ دان1947 کو

فسادات کا سال نہیں نسل کشی کا سال لکھیں گے۔فسادات کو ظلم لکھیں گے،اور دنگوں کو بد معاشی لکھیں گے۔

مراد اس تپتی زمیں پہ گرا تڑپ رہا تھا۔رعنا دھیرے سے اس کے قریب بیٹھ گئی۔باقی عورتیں چیخ رہی تھیں۔نوحہ کر رہی تھیں۔اپنے سامنے اپنے مردوں،بچوں اور رشتے داروں کو مرتے دیکھ گریہ زاری کر رہی تھیں۔لیکن رعنا پہ کمال کے حوصلے اترے تھے۔وہ بے آواز آنسو بہا رہی تھی۔دل پہ جیسے گھونسے پڑ رہے تھے۔لیکن وہ چپ چاپ بس مراد کے سر کو اپنی گود میں رکھے آنسو بہا رہی تھی۔

اس کے بھائی کو سانس لینے میں دقت ہو رہی تھی،اسکی ناک اس کے منہ سے خون نکل رہا تھا۔وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔اپنی بہن کو حوصلہ دینا چاہتا تھا،شاید خود کو بچا لینے کی تدبیریں بتا لینا چاہتا تھا۔رعنا نے اپنا سر نفی میں ہلایا جیسے اسے کچھ کہنے سے روکا ہو۔"پڑھو۔۔۔لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللّٰهِ ۔۔۔۔۔۔"وہ روتے ہوئے آنسو بہاتے ہوئے دہرا رہی تھی۔"پڑھو مراد پڑھو۔۔۔لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللّٰهِ ۔۔۔۔۔۔"

"لا۔۔۔۔۔إِلٰهَ إِ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔الا اللہ۔۔۔۔۔۔۔۔محمد۔رَسُولُ اللّٰهِ۔۔" خون تھوکتی زبان،قبض ہوتی سانس،اور پرواز ہوتی روح کے درمیان ایک روزہ دار نے کلمہ مکمل کر لیا تھا۔اور پھر اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔بدن ڈھیلا پڑ گیا،ساری تکلیف ختم ہو گئی۔سارے درد دور جا سوئے۔امیدوں سے بھری آنکھیں نا امید نیند سو گئیں۔

یہ جانے والے کمبخت چلے جاتے ہیں ہر درد سے آزاد، ہر تکلیف سے نبرد آزما اور ہر خلش سے مطمئن۔ جانے والے اپنے پیچھے سب چھوڑ جاتے ہیں۔ دکھ، تکلیف، رنجش اور نا امیدی۔ گل رعنا نے پاکستان کو اپنا بھائی بھی دے دیا۔ اب بس پاکستان اسکی امیدیں رکھ لے خدا کرے۔۔۔۔۔۔۔ آس پاس عورتیں رو رہی تھیں۔ مردوں کے حوصلے ٹوٹ رہے تھے۔ اور بچے خوف زدہ تھے۔ ملک یونہی نہیں بن جایا کرتے۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

دو دن گزر چکے تھے۔ پچھلے دنوں والے زہر کے واقعے کے بعد ایک مرتبہ پھر فساد برپا ہوا۔

سکھ، "واہے گرو دا خالصہ۔۔ واہے گرو دی فتح۔۔۔۔" چلاتے ہوئے آئے خنجر چلائے، تلواروں سے سر، دھڑ کاٹے۔ زندہ جسموں کو آگ سے جلایا۔ ہندوؤں نے لٹ چکے قافلے ایک بار پھر لوٹے مال، جان، عورتیں کمبخت کچھ بھی پیچھے نہ چھوڑا کئی ہزار کا مجمع اب بس ڈیڑھ سو لوگوں پہ محیط تھا۔ وہ ڈیڑھ سو لوگ جنہیں مسلم لیگ نے اس عتاب سے بچا لیا تھا۔ تیرہ اگست کی رات تھی۔ صبح ہونے میں بس چند گھڑیاں باقی تھیں۔ نوری کا ریڈیو آج بھی اپنی آواز سارے جہاں کو سنا رہا تھا۔

"تیرہ اگست 1947 یہ آل انڈیا ریڈیو لاہور ہے۔ آپ ہمارے اگلے اعلان کا انتظار کیجئے۔"

گل رعنا ملگجے سے لباس میں ملبوس تھی۔ جس کے دامن، سینے اور بازوؤں پہ خون کے دھبے تھے۔ اصل رنگ تو جانے کہاں کھو چکا تھا اور چہرہ دھوئے کئی دن بیت چکے تھے۔ مسلم لیگ کی رضاکار جماعت روز

آتی، کھانا لاتی، کپڑے دیتی،اور امید دیتی کہ بس آج بس آج ایک نیا قافلہ پاکستان کی اور نکلے گا۔لوگوں کے پاس اب کھونے کو کچھ نہیں بچا تھا سوائے امید کے۔

چند پل یونہی پڑے رہنے کے بعد وہ نوری کو بازو سے نیچے اتار چٹائی پہ لٹاتی باہر نکل آئی۔صبح کا ملگجا اندھیرا، آتی صبح اور چھٹتے اندھیرے میں اس نے ایک منظر دیکھا۔ایک ایسا منظر جو اسکی آنکھوں کو پتھرا گیا۔سانس ایک لمحے میں سینے میں قید ہوا،اور دل اتنی زور سے دھڑکا کہ آواز میلوں دور تک گئی۔کامل ہشام رضاکاروں کی جماعت کو ہدایات دے رہا تھا۔وہ اسے دیکھے گئی پلک جھپکے،سانس لئے بغیر۔ایک انجانے سے خیال کے تحت کامل نے نظر موڑ کر دیکھا۔اور کئی لمحات کے لئے وہ بھی ساکت ہو گیا۔آس پاس کی ساری آوازیں بند ہو گئیں۔سارے مناظر دھندلے پڑ گئے۔اندھیرا چھٹ گیا اور گل رعنا اسے اتنی روشن نظر آئی کہ اسکی آنکھیں چبھنے لگیں۔

کئی لمحے وہ دونوں اپنی اپنی جگہ کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔گل رعنا اس منظر کو کئی بار دیکھ چکی تھی۔اپنے خیالات میں،ہر بار جب وہ اسکی جانب قدم بڑھاتی تھی وہ ایک برم کی مانند غائب ہو جاتا تھا۔آج وہ اسکی طرف قدم بڑھا رہا تھا اور گل رعنا کہیں دور بہت دور غائب ہو جانا چاہتی تھی لیکن نہیں ہو سکی۔انسان،کچھ انسانوں کے معاملے میں بہت بے بس ہوا کرتے ہیں۔

"تم واپس کیوں نہیں گئیں رعنا؟" کئی لمحے بعد وہ کیمپ سے ذرا فاصلے پہ تھے۔دو بڑے بڑے پتھروں پہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے۔لال ٹین کی زرد روشنی آج بھی انکی ساتھی تھی،چائے کے بھاپ اڑاتے کپ آج بھی انکے ہاتھوں میں تھے۔

"واپسی کا سفر طویل ہو گیا۔ورنہ میں نے تو آپ کی بات مان لی تھی۔"

”لیکن میں نے تو سنا تھا گل رعنا وقت کے آمرین کی بھی نہیں سنتی۔“

”مردوں کو سنی سنائی پہ یقین نہیں کرنا چاہیے کامل۔زندگی مشکل ہوجاتی ہے۔“ کامل نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا لیا گرم گرم مائع حلق کو جلا گیا۔

”اور بتاؤ کیا تم نے عظیم ہونے کے اصل معنی جان لئے؟ گل رعنا بیگم نے پھر کتنے لوگوں کی مسیحائی کی؟“ گل کو نہ جانے کیوں اس کے لہجے میں ہتک سی محسوس ہوئی۔

”میں نے جو کچھ بھی کیا اللہ کے لئے کیا۔نیکی کا بار بار ذکر اسے دو کوڑی کا کر دیتا ہے۔البتہ اگر آپ چاہتے ہیں میں بدلے میں آپ کی عظمت کے قصے سنوں تو پھر بتاؤ کامل ہشام کتنے عظیم ہو تم؟“ وہ مسکرایا۔کمبخت نے شرم بیچ کر کھائی تھی۔

”میں نے دہلی کے فساد میں پانچ ہزار مسلمانوں کو باحفاظت ٹرین تک پہنچایا،اکیس سو مسلمانوں کو تین روز اپنے جیب خرچ سے کھلایا۔اپنی حویلی کوڑیوں کے دام بیچ کر ساری رقم آج کے قافلے کے لئے ریل گاڑی کی ٹکٹ،کھانے پینے کا انتظام اور لاہور میں چند روز کی رہائش سب میرے ذمہ ہے۔اخباروں میں میرا نام ہے گل۔ریڈیو پہ میرے حق میں آوازیں بلند ہوتی ہیں۔لوگ مجھے عقیدت سے دیکھتے ہیں۔لوگ میرے ہاتھ چومتے ہیں۔میں عظیم ہوں رعنا پنڈتوں کے محلے میں پیدا ہونے والا کامل ہشام لاکھوں مسلمانوں کا لیڈر ہے۔“ گل رعنا چند پل اسے دیکھتی رہی۔پھر نہ جانے کس خیال کے تحت پوچھ بیٹھی۔

"آپ خوش ہیں ؟دل مطمئن ہے؟کیا آپ کو خود پہ فخر ہوتا ہے؟یا پھر جب کوئی آپ کے حق میں توصیفی جملے کہے،کیا آپ کو دلی سکون ملتا ہے؟" کامل کی آنکھوں کی جوت واضح طور پہ بجھ گئی تھی۔ہونٹوں کی مسکراہٹ البتہ قائم رہی۔

"تم بتاؤ گل کیا میں تمھیں خوش نہیں لگتا؟"بھرم قائم رہا۔

"خوشی کا تعلق دل سے ہے۔اور دل اپنے فیصلے خود کرتا ہے۔اپنی آنکھیں بند کریں دل پہ ہاتھ رکھیں اور سوال کریں؟" کامل نے سنجیدگی سے اسے دیکھتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں اور اپنا ہاتھ عین اپنے دل کے مقام پہ رکھا۔

"اے کامل ہشام کے سرمئی دل کیا تم اپنی دی گئی قربانیوں سے خوش ہو۔اپنے ایثار کے جذبے سے مطمئن ہو۔کیا تم عظیم بن چکے؟"اس نے زیر لب دہرایا۔چند لمحے گزرے۔پھر آنکھیں کھول دیں۔رعنا یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیا جواب آیا؟"

"دل کے جواب بس اس کے مالک کو پتہ ہونے چاہیے،باقی دنیا مشہوری کروا دیتی ہے۔" رعنا اس کے جواب پہ ہنس پڑی۔

"میں دنیا کب سے ہو گئی۔اور آپ باقی دنیا جیسے کب ہوئے پتہ ہی نہیں چلا۔"وہ دھیرے سے بڑبڑائی۔

"آج سویرے سارا قافلہ پاکستان روانہ ہو جائے گا۔تم بھی صحیح سلامت وہیں پہنچ جاؤ گی۔اپنے ملک اپنے خاندان کے پاس۔"کامل نے بات پلٹ دی۔

"میرا کوئی خاندان تو بچا ہی نہیں۔اماں اور مراد نہیں رہے۔ابا کئی دن گھر نہیں آتا۔اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔۔میں نوری کو لے کر اکیلی کہاں جاؤں گی؟" اس نے چائے رکھ دی،چہرہ گھٹنوں پہ گرا دیا اور اب وہ بس کامل کو دیکھ رہی تھی۔ہمیشہ کی طرح یکسوئی سے۔وہ کامل سے کوئی بھیک نہیں مانگ رہی تھی۔بس بتا رہی تھی۔رعنا نے باتیں دل میں رکھنا نہیں سیکھا تھا۔

"میں تمھیں اپنے ساتھ لے جاتا گل۔۔۔اگر ہمارا کوئی تعلق ہوتا یا بن سکتا ہوتا۔اب کیا اچھا لگے گا جوان جہاں پھوپھی زاد کو گھر میں رکھ لوں؟" وہ ایسی لا پرواہی سے کہہ رہا تھا کہ جیسے شناسائی کی کوئی رمق کبھی رہی ہی نہ ہو۔

"آپ واقعی اتنے ہی نادان ہیں یا پھر بن رہے ہیں؟"اب بس اب مزید وہ دل میں نہیں رکھ سکتی تھی،سو پھٹ پڑی۔"کیا واقعی ہم دونوں کے درمیان کوئی تعلق نہیں ہے۔پھر اس روز آپ کی اماں کے کمرے میں میری پیشی کیونکر ہوئی تھی۔اگر ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے تو ان زینوں پہ بیٹھ کر مجھ پہ اپنا ماضی کیوں کھولا تھا؟"اسکی آواز بلند نہ سہی ترش ضرور تھی۔کامل چپ چاپ سنتا رہا۔"اگر ہم دونوں کے درمیان کوئی تعلق نہیں تھا تو۔۔"وہ بولتے بولتے رکی۔گیلی زخمی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔"اگر مجھ سے کوئی تعلق نہیں تھا،تو اس روز دل سے فتویٰ لیتے وقت آپ کی آنکھوں کے آگے میرا چہرہ کیوں تھا۔"کامل کے منہ پہ جیسے کسی نے جوتا دے مارا ہو۔سچ کا جوتا۔اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔

”میں نہیں جانتی آپ کا دماغ،دل اور ضمیر کس قید میں ہیں۔لیکن رعنا قیدی نہیں ہے۔آزاد ہے۔اپنے فیصلوں میں،اپنی باتوں میں،اپنے دل کا حال کہنے میں۔کامل ہشام آپ مجھ پہ دستبرداری دے رہے ہیں۔کیونکہ آپ ذہنی غلام ہیں اسے قبول کریں۔“وہ بولتے بولتے ہانپ گئی تھی۔

”تم چاہتی کیا ہو گل۔۔۔۔“ وہ جیسے تھک گیا تھا۔”اچھا مانگو کیا مانگتی ہو۔“

”مانگ کر تو رعنا سانسیں بھی نہ لے۔آپ سے کیا کچھ مانگنا غلاموں سے مانگا نہیں جاتا،غلاموں کو دیا جاتا ہے۔اے کامل ہشام کے غلام دل جاؤ میں نے آج سے تمہارا راز اپنے دل میں دبا لیا۔میں نے تمھیں عطیے میں راز داری دی۔“وہ کہتے ہوئے اٹھی۔ایک اچٹتی سی نظر کامل کے دھواں دھواں ہوتے چہرے پہ ڈالی اور آگے بڑھ گئی۔اسکے قدم کامل کی آواز پہ تھم گئے تھے۔

”اگر تم اتنی ہی اعلیٰ ظرف،عظیم ہو تو میرے سامنے اعتراف کیوں کئے جا رہی ہو۔دل کے جذبات پہ وہی پردہ کیوں نہ ڈالا جو میں نے ڈال رکھا ہے۔آنکھیں چرانے والے کی آنکھوں میں دیکھ کر جتانے والی تم کون ہو؟“

”میرا دل بے عیب ہے۔میں اعتراف کر رہی ہوں کیونکہ میں کھری اور سچی ہوں۔میں اس سر زمین سے آپ کی محبت کی اسیر،اور ان کہی محبت کا بوجھ لے کر کیوں جاؤں۔رعنا آزاد ہے اس کے دل کو بھی آزاد رہنا چاہیے۔“وہ کہتے ہوئے واپس کیمپ کی اور بڑھ گئی۔

کامل کو اس کا جانا برا لگا تھا۔کیا وہ چند پل مزید اس کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھی؟

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

چند گھنٹے بعد

ریل گاڑی سفر شروع کرنے کی تیاری میں تھی۔ہزاروں کی تعداد میں لوگ ڈبوں میں بھرے جا رہے تھے۔تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔پھٹے پرانے کپڑے، مفلس و نادار چہرے، بھوک کے مارے بدن اور جھلستی سازشوں کے مارے لوگ اپنے وطن جانے کو تیار تھے۔

وہ آج ایک بار پھر بوگی نمبر بارہ میں تھی۔جانے کیسا نصیب تھا کہ اسے ہر دفع ریل گاڑی میں بوگی نمبر بارہ ہی ملتی تھی۔بوگی لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔عورتیں، بچے، لڑکیاں اور ان سب کے درمیان دبک کر بیٹھی دو بہنیں۔گل رعنا اور نور العین عرف نوری۔وہ ایک بار پھر ریڈیو کی تاریں چھیڑ رہی تھی۔گھر گھر کی آواز کے بعد بلاخر چند صاف اور واضح آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔کامل ہشام سارے لوگوں کو دلاسا دے کر اب بوگی نمبر بارہ کی جانب آگیا تھا۔بس یہ آخری بوگی تھی، اس کے بعد وہ یہاں سے نکل کر چند اعلیٰ افسران کے ساتھ گاڑی میں سوار ہو کر ایک شان سے پاکستان جانے والا تھا۔لوگوں کے جھمگٹے سے نکل کر گل رعنا کو نظر انداز کرتا وہ باہر جا رہا تھا جب ریڈیو کی آواز واضح ہوئی۔

"چودہ اگست 1947 یہ ریڈیو پاکستان لاہور ہے۔آپ کو پاکستان مبارک ہو۔۔۔

"۔

وقت نے گہری سانس لی، آسمان نے تشکر کے آنسو بہائے، سورج نے اپنی حدت کم کر دی اور اڑتے پرندے اس اعلان کے رعب سے ایک پل کے لئے ٹھہر کر بیٹھ گئے۔ آس پاس فضائیں رقص کرنے لگیں ،اور غلام دل کا مالک، ذہنی غلام نظر چراتا بوگی نمبر بارہ سے باہر نکل گیا۔

اعلان نہیں تھا،یہ صرف ایک اعلان ہو ہی نہیں سکتا تھا۔لاکھوں لوگوں کی ریاضتیں، قربانیاں، ایثار بلاخر قبول ہوا تھا۔اس آواز نے لوگوں کے رونگٹے کھڑے کر دیئے تھے۔دیوانے کا خواب سچ ہو گیا تھا۔بٹوارا ہو چکا تھا۔لاہور کی کنیت میں پاکستان کا نام آگیا تھا۔کیا نعمتوں کی کوئی حد رہ گئی تھی۔؟

پیغام بار بار دہرایا جا رہا تھا۔مرد سجدے میں گر پڑے تھے۔عورتیں آوازوں کے ساتھ رونے لگی تھیں۔نو عمر لڑکے لڑکیاں جوش سے نعرے لگانے لگے تھے۔بڑے بوڑھوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا لئے تھے۔گل رعنا کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔بلاخر اسے وہ خواب پورا ہوتا نظر آیا تھا جس کے لئے وہ اپنا آدھا خاندان گنوا چکی تھی۔

لیکن کچھ خواب شاید پورے ہو کر بھی ادھورے رہ جاتے ہیں۔پاکستان کی حدود کے باہر ریل گاڑی میں چند لوگ سوار ہوئے۔ماتھے پہ سرخ پٹیاں باندھے لوگ ہاتھوں میں ہتھیار لئے اندر داخل ہوئے۔بھڑکتے کرتوں والے مرد لوگوں کے جسم کاٹنے لگے۔ایک ایک بوگی میں آگ لگائی جانے لگی۔خون کا ایک سیلاب تھا جو بہہ رہا تھا۔آہیں عرش تک جاتی تھیں۔

بوگی نمبر بارہ کی گل رعنا نے اپنی بہن کو خود سے لپٹا لیا،لیکن کب تلک کسی نے اسے بالوں سے کھینچ کر باہر نکالا اور پھر پے در پے اس کے پیٹ، سینے اور پسلیوں میں چاقو مارتے چلے گئے۔اس کی آنکھیں ابل رہی تھیں۔وہ ہاتھ بڑھا کر نوری کو یہاں سے جانے کا کہہ رہی تھی،لیکن دیر ہو چکی تھی۔ مشتعل

لوگوں نے اس کی چھوٹی بہن کے پیٹ میں تلوار گھسا دی۔بچی تڑپنے لگی تھی۔اسی لمحے لوگ اتر گئے چند لمحوں کا کھیل تھا اور سب تباہ ہو گیا تھا۔پاکستان جانے والی وہ ریل گاڑی انسانوں سے بھری ہوئی تھی۔لیکن سرزمین پاکستان پہ بس لاشیں واپس آئی تھیں۔

بوگی نمبر بارہ کی گل رعنا کی آنکھیں چھت سے جا لگیں۔جسم ڈھیلا پڑ گیا۔سانسوں نے جسم کا ساتھ چھوڑا اور سماعتیں سن ہو گئیں۔گل رعنا نے پاکستان کو ایک اور قربانی دے دی تھی۔

اپنی سانسوں کی قربانی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

دس سال بعد۔

پاکستان کے قیام کو دس سال بیت چکے تھے۔ملک ترقی کی جانب گامزن تھا۔لوگ خوش تھے۔شاید مطمئن بھی۔پاکستان بننے کے شروعاتی چند سالوں میں ہندوستان نے کئی قسم کی رکاوٹیں لانا چاہیں۔نئے ملک پہ ہتھیار روک اسے دفاعی طور پہ کمزور کرنا چاہا۔خزانے کی نا انصافی سے اقتصادی کمزوری اور ملک پہ پانی روک کر اندر کے بدلے کی آگ مٹانی چاہی۔ہماری کہانی کا مرکز اس وقت لاہور کے ایک بیابان میں جل کر خاک ہو چکی ریل گاڑی ہے۔جہاں چند دنوں میں ایک تھیٹر ڈرامہ پیش ہونا تھا۔جس میں اعلیٰ پائے کے فنکاروں نے حصہ لیا تھا۔

ساری ریل گاڑی جل کر خاک ہو چکی تھی۔لیکن بوگی نمبر بارہ جوں کی توں تھی۔یہ ریل گاڑی چودہ اگست 1947 کو ہندوؤں اور سکھوں کے عتاب کا نشانہ بنی تھی۔اس وقت لکھاریوں کا ایک ٹولہ،کچھ

ادبی شعبے،اور کچھ تھیٹر سے تعلق رکھنے والے افراد بوگی نمبر بارہ کے باہر موجود تھے۔عالمی سطح پہ ہونے والے ایک تھیٹر ڈرامہ میں پاکستان بننے کی مشکلات کا ذکر ہونا تھا جس کے لئے لکھاری موجود تھے۔جس کی کہانی سب سے اعلیٰ وہی کہانی ڈرامہ کے لئے استعمال ہونے والی تھی۔فنکاروں کو ابھی سے یہاں بلایا گیا تھا تاکہ جگہ دیکھ اپنا ذہن تیار کر سکیں۔مہمان خصوصی اب تک نہیں آ سکے تھے۔وہ دس سال پہلے ہونے والے واقعات کے عینی شاہد تھے۔کچھ وقت بعد فنکار اپنے کام کو چلے گئے،اور لکھاری کہانی کے انتظار میں وہیں رہے۔

چار لڑکیاں اور ایک لڑکا۔سب کی عمر تقریبا انیس یا بیس کے قریب تھی۔یہ ان کے کیریئر کا آغاز تھا۔اور آغاز ہی اتنے بڑے منصوبے کے ساتھ تھا کہ انکے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔اللہ اللہ کر کے انتظار ختم ہوا اور مہمان خصوصی آتے دکھائی دیئے۔چالیس کے ہند سے کو چھوتا ایک خوش شکل مرد۔مضبوط جسامت۔رنگت گہری،آنکھیں ذہین۔بال اچھے سے جما رکھے تھے۔ان کے چہرے پہ مسکراہٹ تھی۔کچھ سال قبل تک وہ سیاست سے منسلک تھے،لیکن اب وہ ریڈیو کے لئے کام کرتے تھے۔کئی فلاحی تحریکیں چلاتے تھے۔عالمی سطح پہ مقبول انسانیت کے علمبردار۔

کامل ہشام آج بھی اخباروں کی سرخیوں میں تھا۔وہ قریب چلا آیا تو تمام لکھاریوں نے اسے سلام کیا۔عقیدت تھی کہ کیا اس آدمی سے نظر نہ ہٹتی تھی۔لوگ اس کے لئے دیوانے تھے۔باتیں بس اسکی کی جاتیں اور اسی کی سنی جاتی تھیں۔

لکھاریوں سے بات کرتے ہوئے اسکی گردن تفاخر سے اٹھی تھی۔کامل ان سے بات کر رہا تھا جب اسے بوگی نمبر بارہ کے دروازے سے کوئی جھانکتا نظر آیا۔کوئی شناسائی کی سی رمک تھی۔اس نے مڑ کر

دیکھا لیکن سوائے ایک پلو کے اسے اور کچھ نظر نہ آیا۔اس نے حیرت سے گردن واپس موڑ لی۔یونہی شاید کوئی خیال ہو۔وہ ایک بار پھر اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ لوگوں سے بات کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد وہ پانچ لکھاری اور کامل ہشام ایک ٹینٹ کے نیچے بیٹھے تھے۔کامل ہشام اتنا جاذب نظر،نرم اور پر خلوص تھا کہ اس سے رعب سا محسوس ہوتا تھا۔

"سر کیا آپ نے ان تمام لوگوں کی مدد کی تھی جس جس نے آپ سے مدد مانگی؟یا پھر کوئی ایسا تھا،جس کی آپ چاہ کر بھی مدد نہ کر پائے ہوں؟" انعم کی بات پہ ایک لمحے کو کامل تھم گیا تھا۔اسے آج بھی وہ آنکھیں یاد تھیں،انکی التجا یاد تھی۔وقت پر لگا کر اڑا تھا لیکن کامل ہشام آج بھی بوگی نمبر بارہ میں قید تھا۔کئی لمحے وہ جواب نہ دے سکا تو انعم نے گلا کھنکھار کر اسے متوجہ کیا۔

"اصل میں،میں اس لئے پوچھ رہی ہوں تاکہ اس وقت کی بے بسی بھی لکھ سکوں۔کچھ لوگ ایسے تھے ناں جو چاہ کر بھی مدد نہ کر پائے۔"

"ایسا کوئی انسان،کوئی حالات نہیں ہوتے جب آپ کسی کی مدد کرنا چاہیں اور کر نہ سکیں۔کئی بار آپ خود غرض ہوجاتے ہیں اور بس۔" اس نے پچھلی بات کا جواب نہیں دیا۔لیکن جس بات نے اس کے دل و دماغ کو ہلا دیا تھا اسکا جواب ضرور دیا۔اب کوئی دوسری لکھاری اس سے کوئی الگ سوال کر رہی تھی۔جب کامل نے ایک بار پھر اسے دیکھا۔اس نے وہی شال اوڑھ رکھی تھی۔وہی آنکھیں،وہی آدھا نقاب۔برقعے کے اوپر پہنی شال لہراتے ہوئے وہ ایک بار پھر آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔اب کے اس کے ماتھے پہ پسینے کے ننھے ننھے قطرے ابھرے۔کیا وہ برم تھا؟یا پھر ان دیکھا سچ۔یہ کیا ہو رہا تھا۔یہ کیا تھا۔آنکھوں کا دھوکا یا پھر یاد کا تازہ ہونا۔وہ ایک بار پھر اس ریل گاڑی کے سامنے

تھا۔بچپن میں اس نے پنڈت جی سے سنا تھا کہ جہاں جو انسان مرا ہو اسکی آتما (**روح**)وہیں منڈلاتی ہے۔یہاں تک کہ اسے مکتی (**آزادی**)نہ مل جائے۔

”سر مجھے یہ پوچھنا تھا کہ کیا دس سال پہلے آپ نے کوئی ایسا واقعہ دیکھا جب اپنوں نے ہی اپنوں سے ہاتھ چھڑا لیا ہو۔یعنی ہندو اور سکھ نہیں اپنے مسلمان بہن بھائی؟“ کامل نے ماتھے پہ آئے پسینے کو پونچھا۔

”نہیں ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔قربانی اور ایثار کا جذبہ اس دور میں بے تحاشا تھا۔لوگ ایک دوسرے کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار تھے۔“ **(اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ،وہی شخص ہے جس نے اپنی ہی محبت سے دستبرداری دی تھی۔)**

”چائے پیئیں گے کامل ہشام؟“ آواز پہ اس نے کرنٹ کھا کر پیچھے دیکھا۔نقاب سے جھلکتی سیاہ آنکھیں،سیاہ برقعہ،نیلی چادر۔اسے سانس لینے میں دشواری ہوئی۔چند لمحے کے لئے وہ بلکل ششدر رہ گیا۔وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔سیاہ آنکھیں اسے دیکھ رہی تھیں۔کامل کو اپنی آنکھوں پہ یقین نہ آیا۔وہ آج دس سال بعد یوں اپنے روبرو اسے دیکھ رہا تھا۔روحیں ہوتی ہیں ،وہ واپس آتی ہیں۔بات کرتی ہیں۔بچپن کا پڑھایا پاٹ سچ بن کر سامنے آیا تھا۔

”جناب آپ ٹھیک ہیں؟“ نومی نے اسے کندھے سے پکڑ کر اس کا رخ اپنی جانب کیا۔کامل نے واپس تیزی سے گردن موڑی لیکن اب وہاں کوئی نہیں تھا۔اسکی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا۔

"کیا تم لوگوں کے ساتھ رعنا بھی آئی ہے؟ گل رعنا۔۔وہ بھی لکھاری بننا چاہتی تھی۔وہ بوگی نمبر بارہ کی مسافر تھی۔کیا تم لوگوں نے اسے دیکھا ہے؟" وہ ایک آس سے ان سب کے چہرے دیکھ رہا تھا۔دس سال ایک سراب کے پیچھے بھاگنا مذاق نہیں تھا۔دس سال وہ قیدی رہا تھا۔محبت کا ، ضمیر کا، گل کی سیاہ آنکھوں کا۔

"ہم نے ایسی کسی لکھاری کا نہیں سنا جناب۔کیا معلوم وہ لکھاری نہ بن سکی ہو،کیا معلوم اسے آزادی نہ مل سکی ہو۔۔" نومی نے لا علمی سے کندھے اچکائے۔باقی سب بھی متفق تھے۔کامل کی رنگت واضح طور پہ سفید پڑ چکی تھی۔اسکا دل بے چین ہو رہا تھا۔یہ نظر کا دھوکہ نہیں تھا۔یہ کچھ تھا،کوئی سچ کوئی ادھوری کہانی۔

"وہ لکھاری بن گئی ہو گی۔خواب پورے ہو جاتے ہیں۔آزادی ہر ایک کے لئے ہوتی ہے۔" سب لوگ ٹکر ٹکر اس کا چہرہ دیکھنے لگے تھے۔کامل دھیرے سے دوبارہ اس کرسی پہ بیٹھ گیا۔اب کے اس کے انداز میں واضح بے چینی تھی۔وہ بس کسی طرح یہاں سے چلے جانا چاہتا تھا۔

"سر میں محبت کی کہانی لکھ رہی ہوں۔۔"فوزیہ نے کہنا شروع کیا۔"اگر آپ کو برا نہ لگے تو کیا میں کچھ سوال کر لوں؟"

"جی پوچھیں میں یہاں جواب دینے ہی آیا ہوں۔"اس نے ماحول ہلکا پھلکا کرنا چاہا۔

"کیا آپ نے دس سال پہلے اس برزخ کے عالم میں کوئی ایسا مرد دیکھا تھا جس نے اپنی محبت سے آنکھیں پھیر لی ہوں۔یا پھر کسی قسم کی مراعات کے لئے دل کی خوشی قربان کر دی ہو۔اور اگر آپ

نے ایسا مرد دیکھا تھا،تو آپ اس کے بارے میں کیا کہیں گے؟" چند لمحے وہ غائب دماغی سے انہیں دیکھتا رہا۔اسے کبھی لکڑی کے ستون کے پیچھے کوئی پلو لہراتا نظر آتا،کبھی اسے اپنے قریب کوئی آہٹ محسوس ہوتی۔کامل ہشام کا دل اچھل کر حلق میں آرہا تھا۔اسے لگا یہ وہم ہے یا شاید بوگی نمبر بارہ کو ایک بار پھر اپنے سامنے دیکھ اسکی تمام یادیں تازہ ہو رہی تھیں۔

"میں کسی کو جانتا ہوں جس نے ایسا کیا تھا۔اور وہ پچھتا رہا ہے۔وہ بس ایک موقعے کی تلاش میں ہے۔بس ایک بار اسے اپنی غلطی ٹھیک کرنے کا موقع ملے اور وہ سب کچھ ٹھیک کر سکے۔کاش اسے ایک بار وہ موقع مل جائے۔" وہ غائب دماغی سے کہہ رہا تھا۔دل دماغ کہیں دور اٹکا تھا۔

"سر میرا ایک سوال ہے۔" اب کے بشری نے سوال کرنا چاہا مگر کامل اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہم اس بیٹھک کو کل دوبارہ شروع کریں؟میری طبیعت کچھ ناساز ہے؟" وہ غائب دماغی سے کہہ رہا تھا۔اور پھر بغیر کسی کا جواب سنے وہ وہاں سے نکلتا چلا گیا۔اسے تکلیف ہو رہی تھی،اسے خوف آ رہا تھا۔اسے محبت یاد آ رہی تھی۔لکھاری اسے حیرت سے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

اگلی صبح۔

اگلی صبح وہ وقت سے پہلے آگیا تھا۔آج کچھ فنکار،اور ہدایت کار بھی جمع تھے۔کامل ہشام ایک شخصیت تھا۔ایک بھرپور وقت ان تمام لوگوں کے ساتھ گزار لینے کے بعد وہ ایک بار پھر ان پانچ لوگوں کے ساتھ تھا۔آج چہرے پہ تھکی تھکی مسکراہٹ تھی۔وہ شب خوابی کا شکار رہا تھا۔ٹینٹ کے اندر آج نرم

قالین بچھا تھا۔یہ سردی کے دن تھے دھوپ نرم اور بدن کو بھاتی تھی۔وہ آج ایک بار پھر لکھاریوں کی معلومات میں اضافہ کر رہا تھا۔کل سے کہانی تیار ہونے والی تھی۔اور اگلے ہفتے تھیٹر میں تیاری شروع ہو جانی تھی۔

"جناب مجھے یہ جاننا تھا کہ۔۔"

کامل اسکے باقی الفاظ نہیں سن سکا۔سیاہ آنکھوں والی لڑکی عین اسکے سامنے آ کر بیٹھ گئی تھی۔چہرہ گھٹنوں پہ رکھے،آنکھیں اسکے چہرے پہ ٹکائے وہ مسکراتی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔یہ آنکھیں،کامل ان آنکھوں کو کیسے بھول سکتا تھا۔وہ سانس لئے بغیر اسے دیکھتا رہا۔دس سال،دس سال اس نے ان آنکھوں کو اپنے خواب میں دیکھا تھا۔یہ آنکھیں اس کے دل پہ نقش ہو گئی تھیں۔وہ ان آنکھوں کو کیسے بھول سکتا تھا کل تک یہ سب اسے ایک وہم لگا تھا۔لیکن آج وہ حقیقت بن کر سامنے بیٹھی تھی۔وہ دھیرے سے اپنی کرسی سے اٹھ کر نیچے آ بیٹھا۔لوگ اسے دیکھ رہے تھے،اسے کوئی پرواہ نہیں تھی۔رعنا اس کے سامنے تھی اسے باقی ساری دنیا جھوٹ لگی۔

وہ عین رعنا کے سامنے بیٹھ گیا۔اس کی آنکھیں دیوانہ وار ان سیاہ آنکھوں کو دیکھ رہی تھیں۔کامل کو اندازہ نہیں ہو سکا مگر اسکا چہرہ گیلا ہو رہا تھا۔اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنے سامنے بیٹھی لڑکی کو چھو کر دیکھنا چاہا،اسکا ہاتھ ہوا میں معلق رہ گیا۔لڑکی نے گردن ایک جانب ڈھلکا دی تھی۔یوں جیسے وہ اسے ستا رہی ہو۔

"میں نے کئی سال تمہارا انتظار کیا ہے رعنا۔" اس کے لبوں سے دھیرے سے چند الفاظ نکلے۔آس پاس بیٹھے لکھاریوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی تھی۔کامل اب تک کسی طلسمی لمحے کے زیر اثر اسے تکتا

رہا۔اسی پل وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔کامل بے چینی سے اسکے ساتھ اٹھا تھا۔”رعنا میری بات سنو خدا کے لئے مت جاؤ۔“

”جناب آپ ٹھیک ہیں؟آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟“ فکر مند سا نومی فوراً اس کے قریب چلا آیا۔نقاب والی لڑکی اس سے دور جا رہی تھی۔کامل اسکے پیچھے جا رہا تھا۔جب نومی نے اسے کندھوں سے تھام کر روکا،انعم پانی لئے کھڑی تھی اور فوزیہ بے تحاشا حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”جناب آپ کی طبیعت خراب لگ رہی ہے۔آپ کو گھر جانا چاہیئے۔“

”مجھے جانے دو،مجھے رعنا کے پاس جانے دو،وہ اس طرف گئی ہے۔مجھے بھی وہاں جانا ہے۔اس نے کہا تھا وہ بوگی نمبر بارہ کا سفر میرے ساتھ کرنا چاہتی ہے مجھے اس کے ساتھ جانے دو۔“ وہ خود کو چھڑواتا ہوا بھاگ رہا تھا۔نومی نے اسے روکنا چاہا،لیکن روک نہ سکا۔وہ کسی جادوئی لمحے کے زیر اثر تھا۔دس سال وہ اسے اپنے وہم میں دیکھتا رہا تھا،آج دس سال بعد وہ حقیقت تھی۔اور اگر حقیقت نہ تھی تو اسے گل رعنا کا سراب ہی کافی تھا۔

جلی ہوئی تباہ شدہ ریل گاڑی آج بھی اس بیابان میں کھڑی تھی۔جہاں نیا ریل بند تیار ہو رہا تھا۔مزدور اپنے کام میں لگے تھے۔کچھ مزدور اسی ریل گاڑی کی بوگیوں کے ٹکڑے کر رہے تھے تاکہ ان کو یہاں سے لے جانے میں آسانی ہو سکے۔کامل نے اسے بوگی نمبر بارہ میں جاتے دیکھا تھا،سو اسی طرف دیوانہ وار لپکا۔وہ اندر آیا تو خون اور ہڈیوں کی بدبو آج بھی ویسی تھی۔وہ کھڑکی کی طرف چہرہ کئے بیٹھی تھی۔کامل نے اپنی رگوں میں سکون اترتا محسوس کیا۔وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا آیا اور اس

کے سامنے آ کر بیٹھا۔نقاب سے جھلکتی سیاہ آنکھیں وقت کی گردشوں کے بعد بھی اپنا سحر نہ کھو سکی تھیں۔

"یہ تم ہو ناں گل رعنا۔میں جانتا ہوں یہ تم ہو۔جانتی ہو میں نے تمہارا کتنا انتظار کیا ہے؟"وہ کس بے سکونی،کس بے تابی سے پوچھ رہا تھا۔یہ لمحہ،یہ وصل اسے خواب لگا۔زندگی اسے جنت لگی۔

"دس سال پہلے کامل ہشام نے تم سے آنکھیں چرا کر غلطی کی تھی رعنا۔آج دس سال بعد میں یہاں تمہارا مجرم بن کر موجود ہوں۔تم میری آزادی تھیں رعنا،تمھارے بعد میں غلام ہو گیا ہوں۔مجھے اس غلامی سے نکالو خدا کے لئے۔"وہ اس کے سامنے ہاتھ باندھے ہوئے تھا۔رعنا یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔کامل شرمندہ تھا۔بے چین بھی۔

"دس سال قبل امرتسر کے اس باغ میں،میں نے تم سے جھوٹ کہا تھا۔میری آنکھوں نے اس روز تمہارا چہرہ دیکھا تھا۔دل نے تمھارے حق میں فتویٰ دیا تھا۔میرے ساتھ چلو رعنا۔مجھے آزادی دلواؤ۔"اس نے آگے بڑھ کر ایک بار پھر اسے چھونا چاہا مگر وہ بدک کر دور ہٹی۔کامل کے دل کو دھکا سا لگا تھا گل رعنا نے کبھی اس کی پیش قدمی نہیں ٹھکرائی تھی۔

"رعنا میں کبھی بھی عظیم نہیں بن سکا۔میرا دل کبھی بھی مطمئن نہیں ہو سکا۔میرے لئے آزادی رہی ہی نہیں خدا کے لئے مجھے اس غلامی سے باہر نکالو۔" وہ اس کی ملتجی نظروں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔کامل ایک بار پھر اسکے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ آگے بڑھ رہی تھی۔کامل اس کے پیچھے جا رہا تھا۔وہ یوں بغیر کچھ کہے جا نہیں سکتی تھی۔

”رعنا۔مجھے ایک موقع دو۔ایک بار میری بات سن لو۔میں مجبور تھا گل۔میرے اپنے مسائل تھے۔تم ضد چھوڑ دیتی تو یہ دس سال ہمارے درمیان نہ آتے۔“ وہ بوگی نمبر بارہ سے باہر آگئی تھی۔اور اب، اب ریل کی نئی بننے والی پٹڑی پہ چل رہی تھی۔کامل اب بھی اس کے پیچھے تھا۔

”میں نے ان دس سالوں میں تمہاری جگہ کسی کو نہیں دی۔میں مجبور تھا رعنا اور تم ضدی۔ایک بار میری بات سن لو۔خدا کے لئے تم دس سال پہلے والی کامل ہشام مت بنو۔“

”گل۔۔۔۔“اسکے باقی کے الفاظ ادا ہی نہ ہو سکے۔ریل کی پٹڑی میں اسکا پیر الجھا اور وہ رپٹ کر نیچے گر گیا تھا۔سخت لوہا سر پہ لگا اور چند لمحوں میں اسکا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔

اندھیرا گپ اندھیرا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

عالم بیداری ہر ایک کے لئے نعمت نہیں ہوتی۔اس نے آنکھیں کھول لیں تو چند لمحے اسے اپنا سر درد سے پھٹتا محسوس ہوا۔وہ اپنے گھر میں تھا اتنا اندازہ تو اسے ہو ہی گیا تھا۔سر میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔حلق سوکھ رہا تھا۔چند لمحے یونہی پڑے رہنے کے بعد وہ اٹھا بیٹھا۔سر کو ہاتھوں میں گرا دیا۔اور کچھ دیر قبل ہونے والا واقعہ ایک جھماکے سے اسکے ذہن میں آیا۔اس نے تیزی سے پیر بستر سے نیچے اتارے،اسکے پیروں میں چپل نہیں تھی لیکن وہ گھر میں دیوانہ وار بھاگتا ہوا نیچے جا رہا تھا۔پھٹتا ہوا سر،خشک ہوتا ہوا حلق اسے کسی چیز کی پرواہ نہیں تھی۔

اپنی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے چابی لگائی، ملازم اس کے آگے پیچھے تھے۔وہ اسے روک رہے تھے لیکن وہ نہیں سن رہا تھا۔لاہور کی سڑکوں پہ اسکی گاڑی اپنی پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی۔بلآخر وہ دوبارہ اس بیابان میں آگیا تھا۔جہاں وہ ادھ جلی ریل گاڑی تھی۔لیکن اب وہاں وہ ادھ جلی ریل گاڑی نہیں تھی۔کامل کو اپنا دل رکتا محسوس ہوا۔مزدور اب اپنا سامان باندھے گھر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔کامل پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس خالی جگہ کو دیکھ رہا تھا۔اسے اب بھی یقین نہیں آرہا تھا۔جب ایک ادھیڑ عمر مزدور کی نظر اس پہ پڑی۔وہ مخلص سی فکرمندی سے آگے بڑھ آیا۔

"کامل بابو آپ ٹھیک تو ہیں ناں؟ صبح آپ کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔اب کیسے ہیں؟"

"یہاں سے ریل گاڑی کہاں گئی۔بوگی نمبر بارہ کہاں ہے۔وہاں گل تھی میری گل۔بوگی نمبر بارہ کہاں ہے؟" اسکا چہرہ گیلا تھا۔حلق دکھ رہا تھا۔بوڑھے مزدور نے تاسف سے سر ہلایا۔

"ڈیڑھ سال سے یہاں کام کر رہا ہوں بابو۔۔۔وہ نیلی چادر والی لڑکی نہیں آتما ہے۔" کامل ہشام جہاں تھا وہیں تھم گیا۔اسے دنیا اپنے سر پہ گھومتی محسوس ہوئی۔

"کئی بار ہمیں بھی نظر آئی ہے۔بھولے بھٹکوں کو راستہ دکھاتی ہے۔اور راتوں میں لالٹین لے کر گھومتی ہے۔میرے ساتھ جو مزدور کام کرتا ہے اس نے بتایا تھا کہ دس سال پہلے کسی حادثے میں اس کی موت ہو گئی تھی۔تب سے بیچاری کی آتما یہاں سے وہاں بھٹک رہی ہے۔بھگوان اسکی آتما کو شانتی دے۔" وہ ہندو مزدور دعائیہ لہجے میں کہتا کامل کا کندھا تھپکتا آگے بڑھ گیا۔کامل اب تک سن تھا۔ساکت شل۔

پھر دھیرے دھیرے وہ اس پتھریلی زمین پہ بیٹھ گیا۔اسکی آنکھیں نیم مردہ ہو گئی تھیں۔گردن میں پھندہ تنگ ہونے لگا تھا۔وہ جس آزادی کی امید پہ یہاں آیا تھا وہ اب نہیں رہی تھی کامل ہشام ایک بار پھر غلام بن گیا تھا۔

”کاش میں اسے مکتی (آزادی) دلا سکتا۔میں گل کو نہیں بچا سکا۔وہ ساری زندگی یوں ہی رہے گی۔اور یہ گناہ میرے حصے میں آیا ہے۔“ وہ زمین پہ بیٹھا بڑبڑا رہا تھا۔ٹینٹ کی اور اسکی پشت تھی۔پنڈتون کے محلے سے آیا شخص روحوں کے بھٹکنے پہ ایمان لا چکا تھا۔اور اب ساری عمر کی قید اسکا بخت تھی۔اس نے آدھی زندگی مسلمانوں کے ساتھ گزار دی۔لیکن جس کے دل میں کھوٹ ہو،وہ کبھی دین ،دنیا کا نہیں ہو سکتا۔کامل ہشام کا اصل وہی پنڈتوں کا محلہ تھا۔اور وہ آج بھی وہیں تھا۔دل سے بھی ،دماغ سے بھی۔

اب زرا نظر موڑ کر ٹینٹ سے نکل کر اپنے گھر جو جاتے چھ لکھاری کو دیکھو تو۔ایک منٹ چھ ؟ہاں بلکل چھ۔چھٹی لکھاری نے نیلی چادر اُوڑھ رکھی تھی۔اسکی سیاہ آنکھیں بلکل اپنی بہن کی آنکھوں جیسی تھی۔

”تم نے کہا تھا اگر ہم نے تمہاری بات مان لی تو تم اس کہانی کے مقابلے میں حصہ نہیں لو گی۔اب تم اپنی بات پہ قائم ہو ناں؟“فوزیہ اپنے ساتھ چلتی نیلی چادر والی لڑکی سے کہہ رہی تھی۔

”نور العین کی بات پتھر پہ لکیر ہوتی ہے۔یہاں سوال کی گنجائش نہیں ہوتی۔“لڑکی نے چادر سر سے سرکا دی۔بس آنکھیں اس نے اپنی بڑی بہن سے لی تھیں۔اور شاید اعتماد بھی۔

”نور کیا تمہاری بڑی بہن لکھاری بننا چاہتی تھی؟اس نے کچھ نہ کچھ تو لکھا ہو گا؟“

”بکتا ہے کامل ہشام۔گل رعنا کبھی لکھاری نہیں بننا چاہتی تھی۔اسکی تمام کہانیاں میرے لئے تھیں۔“ وہ اکھڑ اور بدتمیز ہو گئی تھی۔وقت نے اسے بدل کر رکھ دیا تھا۔یہ گل رعنا کی نوری نہ تھی۔

”ویسے نور اب بتاؤ تو تمہیں آخر کیا ملا اس آدمی کے ساتھ یہ سب کر کے؟مجھے تو اب وہ اچھا خاصا پریشان لگ رہا ہے۔“ نومی کو صدمہ لگا تھا۔

”اس نے میری بہن سے کہا تھا آزادی ہر ایک کے لئے ہوتی ہے۔غلط کہا تھا۔آزادی ہر ایک کے لئے نہیں ہوتی کل گل رعنا کے لئے نہیں تھی۔آج سے کامل ہشام کے لئے نہیں ہو گی۔“ نفرت بے تحاشا نفرت تھی اس کے لہجے میں۔

”تمہیں کیا لگتا ہے اسے ہمارے اس ڈرامے پہ یقین آگیا ہو گا؟“انعم کو اب بھی شک تھا۔نورالعین مسکرائی۔فریب کار مسکراہٹ ،انتقامی مسکراہٹ۔

”کمبخت پنڈتوں کے محلے سے آیا ہے۔مرنے کے بعد روحوں کی زندگی،سات جنم،اور آتماؤں کا اپنے انتقام کے لئے واپس آنا ان سب پہ اسکا یقین کامل ہے۔آزاد زمین کے ٹکڑے پہ ضرور آیا ہے وہ لیکن ذہنی غلامی ساتھ لایا ہے۔اب جب تک زندہ رہے گا غلام رہے گا۔“

لکھاری اب دور جا رہے تھے۔انکی آوازیں معدوم ہوتی جا رہی تھیں۔

اور پھر اگلے کئی سالوں بعد بھی کامل ہشام بوگی نمبر بارہ کو نہیں بھول سکا۔وہ اس نیلی چادر کو نہیں بھول سکا اور گل رعنا کو نہیں بھول سکا۔اس نے اپنی زندگی کے آخری دن بھی ایک بے یقین غلامی

میں گزارے۔سکون کی نیند اسے کبھی آ نہ سکی تھی۔وہ راتوں میں اٹھ بیٹھتا تھا،اسے روحوں کا خوف سونے نہیں دیتا تھا۔اسے گل رعنا کی موت کا غم کھا رہا تھا۔وہ ذہنی غلام تھا۔اور اس نے اپنی بقایا زندگی غلامی میں گزاری۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

سال 2020

وقت :شام کے پانچ۔

جگہ : کراچی۔

یہ ایک book signing ceremony کا منظر ہے۔کراچی کے ایک بہت بڑے ہوٹل میں ایک عظیم لکھاری آج اپنے پیشے سے ریٹائرمنٹ دے رہی تھی۔لوگ نم آنکھیں لئے ہال میں جمع تھے۔ایک تاریخی ناولٹ "**بوگی نمبر بارہ** "سے شہرت حاصل کرنے والی عالمی سطح پہ مقبول لکھاری نور العین آج اپنی آخری کتاب سائن کرنے والی تھی۔بوڑھا وجود ایک آرام دہ صوفے پہ تھا۔اسکے اوپر ایک سفید بتی تھی اور اب وہ لوگوں کو اپنی زندگی کا احوال سنانے کو تیار تھی۔باقی سارا ہال تاریکی میں ڈوبا تھا۔

"آپ کی ہر کتاب گل رعنا کے نام ہوتی ہے۔آج تک آپ نے یہ نہیں بتایا کہ گل رعنا کون تھی۔اور آپ کی کہانیوں میں انکا کیا کردار ہے؟" ایک سترہ اٹھارہ برس کے لڑکے نے سوال کیا تو بوڑھی کہانی کار مسکرائی۔

"یہ سوال پوچھیں کہ گل رعنا کی کہانیوں میں میرا کیا کردار ہے۔" اسکے برجستگی سے کہنے پہ لوگوں نے اچھنبے سے اسے دیکھا۔ "جو کہانیاں میں نے آج تک لکھی ہیں وہ تمام کہانیاں میری بڑی بہن گل رعنا کی تھیں۔ میری بہن۔۔ جسے تقسیم ہند کے وقت میں نے کھو دیا۔ وہ ایک کہانی کار تھی۔ لیکن وہ کاغذ اور قلم سے ڈرتی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کے اٹھارہ سال کہانیاں جمع کیں، تاکہ کبھی کسی دور میں نورالعین عرف نوری ان کہانیوں کو صفحات پہ اتار سکے۔ میری بڑی بہن کی خواہش تھی کہ میں کہانیاں لکھوں۔ اور میں نے لکھیں۔ ساری زندگی کہانیاں ہی لکھیں۔ لیکن اب عمر کے اس حصے میں، میں اس پیشے سے دستبرداری دیتی ہوں۔"

"آپ نے گل رعنا کو تقسیم ہند کے وقت کھو دیا؟ یعنی آپ ان فسادات کی گواہ ہیں؟" دبے دبے جوش سے اور حیرت سے پوچھا گیا۔ نورالعین کی آنکھیں یکدم سنجیدہ ہو گئیں تھیں۔ سالوں پرانا بھولا بسرا منظر آنکھوں کے سامنے آگیا۔ کرب نے اس کے دل کو جکڑ لیا تھا۔

"کمال کی بات ہے 1947 میں فسادات ہوئے تھے اور مجھے معلوم بھی نہ ہو سکا۔ حالانکہ میری عمر دس سال تھی۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولی تو لوگ اسے عجیب نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔ نور نے اضافہ کیا۔

"تاریخ دان لکھتے ہیں 1947 میں تاریخ کے بد ترین فسادات ہوئے تھے۔ جھوٹ لکھتے ہیں۔ فسادات نہیں ہوئے تھے۔" وہ ایک پل کو رکی۔ ڈھیر ساری نمی کو اندر دھکیلا۔

"1947 میں تاریخ کی بد ترین نسل کشی ہوئی تھی۔" اسکی آخری بات اتنی آہستہ تھی کہ با مشکل وہ خود سن سکی ہو۔لیکن اتنی تیز بھی تھی کہ لوگوں کو اپنے کان سن ہوتے محسوس ہوئے۔اسکا گلا بھاری ہو رہا تھا دل پہ بوجھ پڑ رہا تھا۔

"1947 میں genocide ہوا تھا۔تاریخ کا بدترین genocide جس میں،میں نے اپنی اماں،بھائی اور گل رعنا کو کھویا۔میری آنکھوں کے سامنے میرے دین کے بہن بھائیوں کو کاٹا جاتا تھا۔انکے جسموں کو آگ لگائی جاتی تھی۔جب میں اپنے خاندان کے ساتھ ہندوستان سے پاکستان کا سفر کر رہی تھی۔تب مجھے ندی،نالوں میں پانی نہیں خون نظر آتا تھا۔کچرے کے ڈھیر پہ کچرا نہیں انسانی اعضاہ ہوتے تھے۔کیا فسادات ایسے ہوتے ہیں؟ جہاں صرف اور صرف مسلمانوں کو مارا جاتا ہو۔مسلمان عورتوں کی عزت خراب کی جاتی ہو۔اور مسلمانوں ہی کے گھروں میں ڈاکے ڈالے جاتے ہوں؟دنیا کا سب سے بڑا بے وقوف انسان وہ ہے جو تقسیم ہند کے دوران ہونے والی نسل کشی کو فسادات کا نام دیتا ہے۔" اسکا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔آنکھیں بھر رہی تھیں۔آج نورالعین کے زخم اکھڑے تھے۔آج وہ بولے گی۔اس نے آدھی صدی اس درد کو اپنے دل میں دبا کر رکھا تھا۔لیکن اب دل تھک گیا تھا۔

"فسادات کیا ہوتے ہیں؟دو گروہوں کا آپس میں بھِڑ پڑنا،کسی کا زیادہ تو کسی کا کم نقصان۔یہ کیسے فسادات تھے جن میں صرف ایک گروہ کا نقصان ہوا۔میری آنکھوں نے سب دیکھا ہے۔ہمارے زخم آج بھی تازہ ہیں فسادات کے نام پہ ہونے والی نسل کشی میری آنکھوں کے سامنے ہوئی تھی۔اور لکھاریوں کا المیہ ہے وہ وہ کچھ بھولتے نہیں واقعات ان کے لئے کہانیاں ہوتی ہیں۔جہاں جہاں سے قافلے گزرا کرتے تھے وہاں وہاں ہندو اور سکھوں کا گروہ ان لٹے پٹے لوگوں کو لوٹ لیتا تھا۔سترہ

سے تیس سال کی کوئی عورت تو پاکستان واپس گئی ہی نہیں۔" ہال میں بیٹھے لوگ رونے لگے تھے۔یہ سالوں پرانی داستان آج بھی دلوں کو چیرنے کا ہنر رکھتی تھی۔ غم تازہ ہوئے۔کرب نے دلوں میں گھر کیا۔

"ہمیں کہا جاتا تھا اگر کوئی پوچھے بھی تو بتانا مت کہ تم مسلمان ہو۔لڑکیوں کو کہا جاتا تھا کہ جب کوئی حملہ ہونے لگے تو خنجر اپنے سینے میں خود مار دینا۔اور میں نے کئی لڑکیوں کو اپنے سینے میں خنجر اتارتے ہوئے دیکھا تھا۔ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کی تعداد پچیس فیصد تھی۔ لیکن واپسی صرف نو فیصد کی ہوئی تھی۔اگر یہ فسادات تھے تو پھر ہم اندھے تھے اور دنیا گونگی۔" وہ بول کے خاموش ہوئی،پھر چند گہرے سانس لئے اور سنجیدہ چہرہ لئے ایک بار پھر مجمع کو دیکھا۔گلابی آنکھیں ڈسٹرب چہرہ۔

"آپ جس دور سے گزر کر اس مقام تک آئی ہیں۔ہمارے لئے آپ باعث فخر ہیں۔لیکن کیا آپ اب خوش ہیں۔ایک آزاد ملک کا خواب جو ہمارے بڑوں نے دیکھا،آپ نے اسے اپنی آنکھوں کے سامنے پورا ہوتے دیکھا۔آپ خوش ہیں؟"ایک اور سوال۔نور نے گردن گھمائی۔

"میں سخت غمزدہ ہوں۔ کبھی کبھی لگتا ہے پاکستان آزاد ہی کیوں کروایا۔یہ جس ملک کو آپ آزاد کہتے ہیں یہاں تو کولر سے ٹنگا ایک گلاس بھی آزاد نہیں ہے۔"گردنیں جھک گئیں۔ نظریں پھیر لی گئیں۔سچائی ہر کسی سے کہاں برداشت ہوتی ہے۔"ملک اس لئے نہیں لیا تھا۔کاش میں اس دور میں ان لوگوں کے جذبے،قربانی،ایثار ریکارڈ کر پاتی تو آج میں آپ کو دکھاتی کہ ملک اس لئے نہیں لیا تھا۔ہم ایک مٹی کے ٹکڑے سے دوسرے ٹکڑے پہ منتقل ہو گئے ہیں۔لیکن ذہن آج بھی وہیں چھوڑ

آئے ہیں۔یہاں بیٹھے تمام لوگوں کو میری باتیں بری لگ رہی ہوں گی لیکن ہم آج بھی ذہنی غلام ہیں۔شادی کی رسموں سے لے کر جنازے کے فرائض تک کیا ہے جسے ہم نے دین کے مطابق کیا ہو؟دو قومی نظریے پہ بنا تھا یہ ملک کہاں گیا ہمارا نظریہ؟“

سارے میں پن ڈراپ سائلنس پھیل گیا تھا۔لوگوں کے چہروں پہ جیسے کسی نے کھولتا ہوا تیل ڈال دیا ہو۔

”شادی کی رسموں میں مایوں،مہندی،ڈھولکی،برائیڈل شاورز یہ تھا اسلامی نظریہ۔جنازے پہ آئی عورتوں کے لئے تین تین کلو دودھ کی بنتی چائے۔چالیس روزہ سوگ۔بوٹیوں پہ لڑتے عوام یہ تھا اسلامی نظریہ؟ہم بحیثیت قوم غلام ہیں۔نظریوں کے،عقیدوں کے۔ہمارے یہاں فنکار تب تک بے کار ہوتا ہے جب تک کوئی گورا یا غیر ملکی twitter پہ اسکی تعریف نہ کر دے۔کوئی اداکار تب تک مقبول نہیں ہوتا جب تک اسے سرحد پار سے بلاوا نہ آجائے۔ہمارے یہاں لیڈر ذات کی بنیاد پہ منتخب کئے جاتے ہیں۔سندھی ہے تو فلاں کو ووٹ ڈالے گا،پنجابی ہے تو فلاں کو اور پختون ہے تو فلاں کو۔چاہے وہ لیڈر کرپٹ ہے،جھوٹا ہے،بد دیانت ہے کوئی فرق نہیں پڑتا ذات کا تو ہے ناں؟یہ تھا آپ کا نظریہ؟یہ اقبال کا نظریہ نہیں تھا۔قائد اعظم کا نظریہ نہیں تھا۔یہ غلامی ہے ذہنی غلامی۔“

”میم ہم آخر کر بھی کیا سکتے ہیں۔ملک جن لوگوں کے حوالے ہے وہ لوگ مکار اور جھوٹے ہیں۔کرپٹ ہیں۔یہاں کوئی ایسا بچا ہی نہیں جو کھرا اور صاف ہو۔ہم اگر تباہی کے دہانے پہ ہیں تو وجہ صرف اور صرف سیاستدان ہیں۔“

نورالعین طنزیہ مسکرائی تھی۔"اس ملک کی تباہی کے پیچھے آپ ہیں۔میں ہوں۔یہ ہیں اور وہ بھی ہیں۔" وہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر لوگوں کی نشاندہی کر رہی تھی۔"وہ دوسرا وقت تھا جب ایک مچھلی سارا تالاب گندہ کرتی تھی۔یہاں اگر ملک کی جڑیں کھوکھلی ہو رہی ہیں تو ذمہ دار ہم سب ہیں۔ملک کیسے چلتا ہے۔کیسے امیر ہوتا ہے۔اور قرضہ کیسے اترتا ہے؟"اس نے رک کر اطراف میں نظر دوڑائی۔ہر کوئی دم سادھے ہوئے تھا۔

"ملک خزانے سے امیر ہوتا ہے۔اور خزانہ ٹیکس سے بھرتا ہے۔آپ لوگوں میں سے صرف ایک صرف ایک اٹھ کر کہہ دے کہ وہ ملکی ٹیکس میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرتا۔اے سی،فریج،اور مختلف مشینری استعمال کرنے کے بعد بھی پورا بل دیتا ہے؟جب بجلی کنڈا لگا کر چوری کی جائے تو چور بس سیاست دان کو نہ کہا جائے۔جب موبائل،گاڑیاں،اسمگل شدہ اشیاء بغیر ٹیکس کے خریدی جائیں تو بد دیانت سیاست دان کو نہ کہیں۔ہم سب ایک جتنے شامل ہیں اس ملک کی بربادی میں۔اگر آپ کو لگتا ہے فلاں لیڈر اقتدار میں آتے ہی سب ٹھیک کر دے گا تو آپ غلط ہیں۔بدلاؤ کی شروعات آپ سے ہوتی ہے۔بتاؤں کیسے؟"وہ خاموش ہوئی تو لوگوں کو اس کے کچھ کہنے کی بے چینی ہونے لگی۔

"اگر ملکی بجلی آپ نہیں بچائیں گے تو محلے والا بھی نہیں بچائے گا۔اگر کچرہ آپ نہیں سمیٹیں گے تو کوئی اور بھی نہیں سمیٹے گا۔گیس کے چولہے جلتے چھوڑ دیں گے تو بند کرنے کوئی نہیں آئے گا۔آپ کو لگتا ہے آپ ایک بجلی،گیس پانی بچا کر کیا کریں گے؟آپ کا پھینکا ہوا ایک شاپر کیا کچرہ پھیلائے گا؟اگر باقی کی بائیس کروڑ عوام بھی یہی سوچنے لگی تو کیا ہوگا؟"ہال میں بیٹھے لوگوں کے چہرے سفید پڑنے لگے تھے۔حقیقت کا تھپڑ بہت زور سے لگتا ہے۔

”جانتے ہیں وہ دو قومیں الگ کیوں ہوئیں؟صدیاں ساتھ گزار دی تھیں لیکن آخر کیوں ایک وقت پہ خیال آیا کہ اب الگ ہوا جائے۔یہ وقت ہے کہ قدم اٹھایا جائے۔بٹوارہ ایک بہت بڑی بات ہوتی ہے۔یونہی شام کی بیٹھک میں چائے پیتے پیتے خیال نہیں آجاتا کہ چلو میاں اب بٹوارہ کرتے ہیں۔سگنلز ! یہ سگنلز ہوتے ہیں جو بٹوارہ کرواتے ہیں۔ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی والے علاقے میں عید کے روز دنگے ہونے لگے تھے۔کیونکہ انہیں لگتا تھا یہ ان کا ملک ہے۔یہ مسلمانوں کے لئے سگنل تھا کہ اب باہر نکلا جائے۔اب جب آپ عید پہ اپنے گھر مٹھائی اور کپڑوں سے بھر دیتے ہیں اور فطرانے بھول جاتے ہیں یہ وقت ہے آپ کے سگنل کا۔“ اس نے ہمیشہ بس لکھا تھا۔آج وہ بول رہی تھی لوگوں پہ لازم تھا کہ اسے سنا جائے۔

”مسلمانوں کے بچوں کو مندر میں تعلیم دی جانے لگی تھی۔کنویں سے پانی نکالنے کے لئے ہمیں گھر سے برتن لانے پڑتے تھے یہ تھے اس دور کے مسلمانوں کے سگنلز۔اب جب بڑی عید پہ جب قربانی کے جانور سیدھے سیدھے کاٹ کر گوشت فریج میں رکھ دیئے جاتے ہیں یہ سگنل ہے بدلاؤ کا۔یہ دور بھی قربانی اور ایثار کا ہے۔یہ دور بھی جنگ کا ہے خود سے جنگ۔کیونکہ جب تک آپ نہیں بدلیں گے ملک نہیں بدلے گا۔“وہ چند پل بلکل خاموش ہو گئی۔لوگ شرمندہ تھے انکو ہونا بھی چاہیے تھا۔

”میری بہن گل رعنا نے اس ملک کے لئے کئی خواب دیکھے تھے۔لیکن پھر ایک روز بوگی نمبر بارہ میں،میں نے اسے کھو دیا۔خواب ختم نہیں ہوتے آنکھیں بدل جاتی ہیں یہ میں نے اس روز سمجھ لیا تھا۔میں اس بوگی کی واحد survivor تھی۔لیکن میرا سفر اب ختم ہو رہا ہے۔میں نے قربانیاں دی ہیں اب آپ کی باری ہے۔آپ ہیں بوگی نمبر بارہ کے نئے مسافر۔“

بوڑھی کہانی کار اپنی کہانی ختم کر چکی۔اب وہ اسٹیج سے پلٹ رہی تھی۔کوئی اسکی وہیل چیئر گھسیٹ رہا تھا۔بوگی نمبر بارہ کی واحد سروائیور اپنا فرض پورا کر چکی تھی۔اب کس کی باری تھی۔؟

ریل گاڑی کے سفر میں، ایک دھرتی سے دوسری دھرتی۔

کچھ خواب آنکھوں کے، کچھ خیال نئے خطے کے،ان سب کے درمیان کئی لوگ چلے۔

وہ لوگ جنھوں نے جانیں لٹائیں، وہ کہ جنھوں نے عصمتیں برباد کروائیں۔

ان کی آنکھیں الوہی خواب بنتی تھیں،انکے ارادے کئی عزم بناتے تھے۔

وہ لوگ اب نہیں، وہ خواب برباد ہوئے، وہ قربانیاں رائیگاں گئیں۔

کیا خواب، عزم، حوصلے،ہمتیں ،جدوجہد، قربانیاں کیا یہ سب یونہی غائب ہوجاتا ہے؟

خواب ختم نہیں ہوتے، آنکھیں بدل جاتی ہیں، عزم سے دستبرداری نہیں دیتے

انہیں کسی اور کو سونپ دیتے ہیں،حوصلے ٹوٹتے نہیں کسی اور کے کندھے پہ رکھے جاتے ہیں۔

مجھ سے سوال کرتے ہو وہ آنکھ کونسی ہے؟وہ کندھے کس کے ہیں؟وہ حوصلے کون جتائے گا۔

عزیز من۔تم ! ہاں تم ہو نئے خواب، مضبوط کندھے،جواں عزم،نئے حوصلے۔ہاں تم

پس تم ہو بوگی نمبر بارہ کے نئے مسافر!

ختم شد